# باتیں ہماری
# یاد رہیں

شاہدہ اُسید رضوی

# باتیں ہماری یادرہیں

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سُنیے گا
پڑھتے کسو کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

میر

# باتیں ہماری یاد رہیں

مولفہ

شاہدہ اُسید رضوی

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

نام کتاب : باتیں ہماری یاد رہیں
مرتبہ : شاہدہ اُسید رضوی
مطبع : گلوری لیس پرنٹرس، دہلی
سرورق : ٹیم عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

# Batein Hamaari Yaad Rahein

A Memorable and Historic Talk with
Qurratul Ain Hyder and
Gopi Chand Narang

*Edited by* **Shahida Osaid Rizvi**
67 Cavendish Avenue, New Malden, Surrey KT36QJ
E-Mail: shahida.rizvi3@gmail.com

Edition: 2021 200/-



ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6 — 011-23260668
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی — 011-23276526
- راعی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد — +91 7905454042
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ — +91 9358251117
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4 — +91 9304888739
- کتاب دار، ممبئی — +91 9869321477
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد — +91 9246271637
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد — +91 9325203227
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ — +91 9433050634
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر — +91 9797352280
- امرین بک ایجنسی، احمد آباد، گجرات — +91 8401010786

**arshia publications**

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

## اِنتساب

# پروفیسر گوپی چند نارنگ

کے نام

جن کی خدا داد صلاحیتوں کی ایک دُنیا قائل ہے۔
جن کی گراں قدر رہنمائی نے میری پہلی کاوش کو میرے لیے
باعثِ فخر اور پڑھنے والوں کے لیے قابل قدر بنا دیا۔

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لُطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

(ندا فاضلی)

# فہرست

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
(غالب)

# دیباچہ

سیّد حسن مرحوم بزمِ اُردو لندن کے بانی اور جنرل سیکریٹری، بی بی سی اُردو سروس سے منسلک تھے۔ اُنھوں نے 1986 میں بزمِ اردو لندن کی بنیاد رکھی تھی جس کے زیرِاہتمام 2012 تک ہر سال کم از کم تین بڑے پروگرام پیش کرتے رہے جن میں اردو ادب کی نامور شخصیات قرۃ العین حیدر، گوپی چند نارنگ، سردار جعفری، افتخار عارف، رضا علی عابدی، یاور عباس کے علاوہ کئی مقامی اور بین الاقوامی شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور براڈکاسٹروں نے حصہ لیا تھا۔ ان کی وفات کو اب آٹھ سال گزر چکے ہیں لیکن اردو ادب کو لندن میں فروغ دینے کے سلسلے میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

سیّد حسن مرحوم نے 23 اگست 1998 کی شام وِمبلڈن میں ادب شناس بیگم مہر نقوی اور محبوب نقوی مرحوم کے گھر ایک محفل گفتگو کا اہتمام کیا تھا۔ اُنھوں نے یاور عباس صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ صاحب سے ان کی تصنیفات اور ادبی پس منظر کے بارے میں سوالات اور بات چیت کریں۔

یاور عباس صاحب کی ملاقات قرۃ العین حیدر سے 1951 میں ہوئی تھی جب وہ بی بی سی اردو سروس میں براڈکاسٹر کے خدمات انجام دے رہے تھے۔ لندن میں کبھی کبھی اُن کی والدہ نذر سجّاد حیدر سے ملنے اُن کے گھر بھی جایا کرتے تھے۔ ممبئی جب بھی گئے اُن کا قیام قرۃ العین کے گھر پر ہی ہوا کرتا تھا۔ میں اُن دنوں بزم اُردو لندن میں جوائنٹ سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی اور بزم کے سارے پروگراموں

کی رپورٹ اخباروں کے لیے لکھا کرتی تھی۔ بہرحال میں بھی اس محفل میں شریک تھی۔ گوپی چند نارنگ نے محفل کے اختتام پر باتوں باتوں میں کہا تھا کہ اس گفتگو کو شائع ہونا چاہیے۔

اس محفل سے فیضیاب ہوئے 22 سال گزر چکے ہیں اور افسوس کہ قرۃ العین حیدر اب ہمارے درمیان موجود نہیں، لیکن گوپی چند نارنگ صاحب کی یہ بات میرے دل پر نقش ہو گئی تھی اور میری دلی تمنا تھی کہ میں ان کی خواہش کو عملی جامہ پہناؤں۔ محبوب صاحب نے میری خواہش پر اس یادگار محفل کے ویڈیو کی ایک کاپی مجھ کو عنایت کی تھی۔

کئی مہینے اور پھر کئی سال گزر گئے۔ اُن دنوں کمپیوٹر وغیرہ کا استعمال کم کم لوگ ہی کرتے تھے۔ ویڈیو ٹیپ پر گفتگو جو بڑی روانی کے ساتھ رواں دواں تھی، اس ویڈیو کو سن کر قلم سے کاغذ پر تو لکھ لیا تھا لیکن کمپیوٹر پر اردو میں ٹائپ کرنے کی صلاحیت اُن دنوں مجھ میں نہیں تھی۔ لیکن ویڈیو ٹیپ اور اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی اس روداد کو ایک انمول خزانے کی طرح محفوظ بھی رکھا تھا۔ اب بائیس سال بعد کووِڈ کے عالمی وبائی دور میں خاموشیوں، سناٹوں اور فرصت کے دنوں میں اپنے ہاتھ سے قلمبند کی گئی۔ دو نابغہ روزگار ہستیوں کی بے حد دلچسپ علمی اور ادبی گفتگو کو پڑھتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی آواز کانوں میں گونجنے لگی کہ اس گفتگو کو ضرور شائع ہونا چاہیے۔

میں نے پوری گفتگو کی نقل جہاں تک ممکن ہوسکا محفوظ کر دی ہے۔ یہ گفتگو قرۃ العین حیدر کے کئی ناولوں، ناولٹ اور افسانوں کے ساتھ ساتھ پچھلی صدی کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تصنیفات کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا قرۃ العین حیدر کے ساتھ ساتھ ان کے ہمعصروں کی تصنیفات پر فی البدیہ تبصرہ اور تنقید اتنا گہرا، جامع اور وسیع ہے کہ سر دُھننے کو جی چاہتا ہے۔ اردو ادب اور تنقید سے دلچسپی رکھنے والے اس گفتگو سے اُس وقت تک مستفید ہوتے رہیں گے

جب تک اردو زبان زندہ ہے۔

گفتگو کو تحریری شکل میں لانے کے بعد اس کو منظر عام پر لانے کی خواہش سر اُٹھانے لگی۔ میں نے مصطفیٰ شہاب سے مشورہ کیا کہ کس طرح اسے اردو ادب کے شائقین تک پہنچایا جائے۔ مصطفیٰ شہاب ایک ادب شناس اور ادب نواز شخصیت ہیں۔ اُنھوں نے میری کاوش کو سراہا اور مشورہ دیا کہ اشاعت سے پہلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب سے فون پر اپنے اس کام کا ذکر کروں۔ میں نے پروفیسر نارنگ صاحب سے فون پر بات کی۔ پروفیسر نارنگ صاحب نے باوجود اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے بہت شفقت اور دلچسپی کے ساتھ میری بات سُنی اور کہا کہ میں اپنے اس ڈرافٹ کی ایک کاپی اُنھیں بھیج دوں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے قیمتی وقت کے کئی گھنٹے فون پر مجھ سے بات کی، اس کتاب کی تزئین وتشکیل کے سلسلے میں میری رہنمائی کی اور میری حوصلہ افزائی کی۔ یہ کتاب میرے خواب کی تعبیر ہے، جس کو پورا کرنے میں بلاشبہ بڑا ہاتھ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا ہے۔

میں اپنی دوست مہر نقوی اور اُن کے شوہر محبوب نقوی مرحوم کی ممنون ہوں اُنھوں نے یہ محفل اپنے گھر منعقد کی۔ میں اُن کے بیٹے آصف نقوی کی بھی شکرگزار ہوں کہ اُنھوں نے اس محفل میں ہونے والی گفتگو کی ویڈیو بنائی اور محبوب نقوی مرحوم نے میری گزارش پر بلاکسی اعتراض یا شرائط کے اُس ویڈیو ٹیپ کی ایک نقل میرے حوالے کردی تھی۔

اس گفتگو کو منظر عام پر لانے میں 22 برس لگ گئے۔ میں نے اس تاریخی بات چیت کو ویڈیو ٹیپ پر سُن کر تحریر میں لانے کا کام 1998 ہی میں شروع کردیا تھا۔ کمپیوٹر پر اردو میں ٹائپ کرنے کی صلاحیت اُن دنوں مجھ میں نہیں تھی نہ ہی ہر گھر میں کمپیوٹر کا استعمال عام تھا۔ جب گفتگو کا تین چوتھائی حصہ کئی مہینوں میں مکمل ہوا تو پوچھ تاچھ

شروع کی۔ کئی صاحب ذوق ادبی شخصیات سے تذکرہ کیا کہ مکمل ہونے کے بعد اس کی اشاعت کا کیا ہوگا لیکن کوئی قابل قبول مشورہ نہیں ملا۔

ایک دن اپنے پُرخلوص دوست مصطفیٰ شہاب سے اس محفل میں ہونے والی گفتگو کی تحریر ذکر کیا۔ اُنھوں نے بلا کسی تامّل کہا کہ میں اُنھیں اس مسودے کی کاپی بھیج دوں۔ مجھے مصطفیٰ صاحب کے خلوص پر پورا بھروسہ تھا اور یقین تھا کہ وہی کوئی نہ کوئی راستہ نکالیں گے۔ دوسرے ہی دن مصطفیٰ شہاب نے فون کیا اور کہا میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کو اپنے کام کے بارے بتاؤں، اور پروفیسر صاحب کا فون نمبر دے دیا کہ جتنی جلدی ہو سکے میں اُن سے رابطہ کروں۔ میں کچھ جھجک رہی تھی کہ پروفیسر نارنگ صاحب نہ جانے کتنے مصروف ہوں گے اور پتہ نہیں وہ ایک اجنبی فون نمبر دیکھ کر شاید فون کا جواب بھی نہ دیں۔ لیکن میری خوشی اور حیرانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب نہ صرف پروفیسر نارنگ صاحب نے میرے آداب کا جواب دیا بلکہ نہایت شفقت سے میری اور میری فیملی کی خیریت پوچھ کر مجھے شاد کام کیا۔ میں نے اپنے کام کے بارے بتایا۔ اُنھوں نے بہت اطمینان کے ساتھ اس محفل کی تفصیل پوچھی اور قرۃ العین حیدر اور اُن کے ہم عصر ادیبوں کے بارے میں بات چیت کی۔ پروفیسر نارنگ صاحب کے کہنے پر میں نے اُنھیں اپنے مسودے کی نقل ای میل کردی۔ پھر اُس کے بعد ہر ہفتے کبھی ایک گھنٹہ کبھی ڈیڑھ دو گھنٹے فون پر ہماری بیٹھک ہوتی رہی۔ میری تحریر اس محفل میں ہونے والی گفتگو کا لفظ بہ لفظ عکس تھی۔ گفتگو کے درمیان کئی جگہ جملے ادھورے تھے، کہیں اچانک موضوع بدل جاتا تھا جیسا کہ عام طور پر گفتگو میں ہوتا ہے۔ ان کو مکمل اور بامعنی بنانے کا کام پروفیسر نارنگ صاحب کے علاوہ اور کون کر سکتا تھا۔ چنانچہ کئی Virtual بیٹھکوں میں اس گفتگو کو سنوارا گیا۔ اس کتاب کی وصف اور اس کی قدر و منزلت بڑھانے میں پروفیسر نارنگ صاحب نے جس طرح میری مدد اور ہمت افزائی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شکریہ ادا کرنا بہت چھوٹی بات لگتی ہے۔ میں

پروفیسر صاحب کی احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے باوجود اپنی بے پناہ مصروفیات کے اس کتاب کے پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک اپنی دلچسپی اور رہنمائی برقرار رکھی۔ مشاہیر کی رائے والے دونوں ابواب میں اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مدد سے سارا مواد فراہم کر کے کتاب کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ کیا۔ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے رفیق محمد موسیٰ رضا کی بھی تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے کتاب کو کتاب بنایا اور اشاعت کے کام میں مدد فرمائی۔

میں بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ پروفیسر نارنگ صاحب کے ساتھ فون پر جو وقت بہت کچھ سیکھنے میں گزارا وہ میری زندگی کے بہترین اور قیمتی لمحات میں شامل ہے جنھیں میں ساری زندگی عزیز رکھوں گی۔

**شاہدہ اُسید رضوی**

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
(میر تقی میر)

# مؤلفہ کے بارے میں چند الفاظ

شاہدہ اُسید رضوی نے حیدرآباد دکن کے ایک ادب دوست گھرانے میں آنکھ کھولی۔ دادا علی اصغر جعفری نے ابو ریحان البیرونی کی مشہور عالم تصنیف 'کتاب الہند' کا اردو میں ترجمہ کر کے تحسین اور شہرت سمیٹی۔ والد علی اُسید جعفری نے علم کی خدمت کی روایت کو برقرار رکھا۔ گھر پر مشاہیر کی آمد ایک معمول تھی۔ دیوان خانے میں مشاعرے منعقد ہوتے (اُن میں سے ایک کی صدارت جگر مرادآبادی نے بھی کی)۔ فانی بدایونی کی رہائش گاہ پڑوس میں تھی جن سے جعفری صاحب کا اتنا قریبی تعلق تھا کہ ان کی گود میں اس عظیم شاعر نے اپنی آخری سانس لی۔ بڑی بہن سیدہ صالحہ کے تبصرے مشاہیر کی تصانیف پر اخبار 'ڈان' میں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ دادا کی تصنیف کی تلخیص بھی کتابی شکل اختیار کر چکی ہے۔ چھوٹی بہن سلیم عالم کے سفرنامے پانچ کتابوں کی شکل میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ایسے ماحول کی پروردہ شاہدہ نے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کے لیے اُردو ادب کا انتخاب کیا اور ایم اے کی سند حاصل کی۔ غنی احمد رضوی سے شادی ہوئی تو 1971 میں لندن آ گئیں۔ حصول روزگار اور گھر گرہستی سے فرصت کے تمام لمحات کتب بینی اور سیاحت میں صرف ہوئے۔ ادبی محفلوں میں شرکت بھی اُس زمانے کا لازمہ رہی۔ لندن کی ایک ایسی ہی بیٹھک (1998) میں دو نابغہ روزگار ہستیوں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور قرۃ العین حیدر کی ادب پر گفتگو نے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ شاہدہ نے ان نادر لمحات کو ویڈیو ٹیپ سے اوراق پر منتقل کر دیا اور یہ منفرد مکالمہ آپ تک پہنچ رہا ہے۔

اُمید ہے یہ یادگار ادبی کاوش نہ صرف آج بلکہ آنے والے دنوں میں اردو شائقین کو پسند آئے گی۔

**عابد علی سیّد**
کراچی

# باتیں ہماری یاد رہیں
# ایک یادگار محفل

سیّد حسن : یہ محفل مہر نقوی اور محبوب نقوی کے یہاں پہلے سے ہی طے تھی۔ میں نے ان سے کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ کو بلا لوں۔ بڑی خوشی سے وہ لوگ تیار ہو گئے۔ اردو ادب کی دو بڑی شخصیتیں اس وقت یہاں موجود ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ رضا علی عابدی اگر یہاں ہوتے تو بتاتے کہ یہ تنقید و تحقیق میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس عہد میں اردو کے جتنے اسکالر تنقید نگار ہیں ان میں گوپی چند نارنگ سب سے بڑے تنقید نگار ہیں۔

پچھلی بار جو جلسہ ہم نے قرۃ العین حیدر کے اعزاز میں کیا تھا اس میں شاید وقت بھی کم تھا اور سوالات بھی مناسب نہیں تھے۔ آج کی محفل کا مقصد یہ ہے کہ ادبی گفتگو کی جائے۔ یہاں یاور عباس صاحب موجود ہیں۔ پچھلی بار وہ قرۃ العین حیدر کے ساتھ نہرو سینٹر میں تھے۔ وہاں بھی سوالات پوچھے گئے تھے لیکن وہ سوالات انگریزی میں کیے گئے تھے۔ بی بی سی لندن کی براڈ کاسٹر پروین مرزا بھی یہاں موجود ہیں۔ میں ان سب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

گزارش ہے کہ سوالات جو بھی ہوں وہ قرۃ العین حیدر کے بارے میں ذاتی نہ ہوں اور یہ گوپی چند نارنگ کے اختیار میں ہوگا کہ نامناسب سوالات کو رد کر دیں۔

گوپی چند نارنگ : اپنے بارے میں مجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ سوجو جی چاہے پوچھیں لیکن اس کا کچھ نہ کچھ رشتہ ادب سے ہونا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر : ہاں ورنہ بات ٹریک سے ہٹ جاتی ہے۔

سیّد حسن : اب میں یاور عباس سے درخواست کروں گا کہ وہ گفتگو کا آغاز کریں۔

یاور عباس : گوپی چند نارنگ اور قرۃ العین حیدر! میں آج آپ دونوں کو Embarass کرنے والا ہوں۔

قرۃ العین حیدر : ہائے ہائے......!

یاور عباس : اس لیے کہ میں جانتا ہوں آپ دونوں جید لوگ یہاں موجود ہیں۔ اور اس لیے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے مداح ہیں۔ میری رائے تو کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک مصنف اور لکھنے والے اور ناول نگار کی حیثیت سے آپ قرۃ العین حیدر کو کیا مرتبہ دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

قرۃ العین حیدر : بڑا Embarrassing سوال کیا آپ نے۔ میرے سامنے یہ کیا کہیں گے۔ تکلفاً جو بھی کہیں گے وہ ماننے کے لائق ہوگا۔ آپ نے سوال بڑا مشکل کر دیا۔ آپ تکلف نہ کیجیے۔

گوپی چند نارنگ : پہلی بات تو یہ ہے کہ جنھوں نے اس محفل کو آراستہ کیا ہے میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔

اگرچہ یہاں پہنچ کر دیکھا کہ بالکل Segregation ہو رہا ہے تو یہ خیال ہوا کہ قرۃ العین حیدر اور ہم دخل در اندازی کر رہے ہیں۔ محفل تو آپ کی پہلے سے طے شدہ تھی۔ بہرحال سیّد حسن صاحب کا بہت شکریہ۔ انھوں نے جو حکم دیا تھا وہ میں وہاں سے لکھ کر بھیج چکا ہوں ......

گوپی چند نارنگ : خیر اگر آپ اُردو ادب کے پورے تناظر میں فکشن کو

دیکھیں، تو پریم چند سے لے کے آج تک فکشن میں اسّی نوے برس میں جو کام ہوا ہے اور جو آرا پیش کی گئی ہیں، فکشن نے ایسی غیر معمولی ترقی کی ہے کہ باید و شاید۔ اور اس بات میں کوئی مغالطہ نہیں کہ اردو میں جو کام ہوا ہے اور تحقیقات پیش کی گئی ہیں، کسی بھی بڑی سے بڑی زبان کے فکشن کے مقابلے میں جو اردو کے ماسٹر پیس ہیں ان کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

تفصیل میں نہ جاتے ہوئے پریم چند کے بعد سے لے کے آج تک جو آزادی کے بعد کا دور ہے ہمارے فکشن کی تاریخ کا، اگر اس نصف صدی دور کو قرۃ العین حیدر کا دور کہا جائے۔ اب اگر وہ یہاں بیٹھی ہیں تو میں انھیں ایمبیر لیس بھی نہیں کر سکتا اور کچھ کھل کر بھی بول نہیں سکتا۔ یہ سمجھیے کہ بالکل Understatement کی زبان میں، میں کم سے کم لفظوں میں عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بیسویں صدی کا نصفِ اول کا دور پریم چند کا ہے۔

لگ بھگ آزادی کے بعد پچاس برس کا زمانہ ہے اور کسی ادبی شخصیت کا نصف صدی سے بھی زیادہ زمانے پر محیط ہونا، اپنی حیثیت کو منوانا ایک بہت بڑی بات ہے۔ ایسی بات ہم غالب کے بارے کہہ سکتے ہیں، علامہ اقبال کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ ہر شخص کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ پھر یہ کہ ان کی جو آمد ہوئی ہے وہ فکشن کے تین بلکہ چار بڑے ناموں کے بعد ہوئی ہے۔ وہ نام ہیں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی۔ لیکن آپ یہ دیکھیں کہ جس طرح انھوں نے فکشن کا مزاج بالکل بدل دیا اور فکشن کی دنیا جو ایک چھوٹی دنیا تھی اس کو انھوں نے ایک ایسی وسعت سے ہمکنار کر دیا۔ آج جو نوعیت ہے اردو فکشن کی وہ نہ صرف زمانوں، قرنوں اور کراں تا کراں، زمین سے آسمان تک ...... اور سب سے بڑا جو مسئلہ ہے وہ ہے وجود کی حقیقت اور انسان کا مقدر، اور وہ کس طرح تہذیب سے تشکیل پاتا ہے۔ اور زماں ...... اور جس طرح عینی نے زماں کا استعمال کیا ہے، جس طرح انھوں

نے تاریخ کی چلتی ہوئی نبض اور جو صدیوں سے تاریخ کا تسلسل ہے برصغیر میں، اس کی روح سے یہ ہم کلام ہوئی ہیں۔ یہ معمولی کام نہیں۔

سب سے بڑی بات کہ جو برصغیر کا ملاجلا طبقہ ہے، تہذیبی Genius سے یہ ہم کلام ہوئی ہیں۔ وہ غیر معمولی ہے۔ جس کو گنگا جمنی تہذیب کہنا چاہیے وہ ہمارا مزاج ہے، جو ہماری Collective Psyche ہے، جس میں ہندو، مسلمان، بدھ، سکھ، عیسائی، پارسی ساری ذاتیں، برادریاں، قومیں، وہ سب لوگ جو برصغیر میں باہر سے آتے رہے اور یہاں بستے رہے ہیں۔ ہزاروں سال سے ان سب کے باہمی Sociological اور Historical عمل سے جو ایک رنگارنگ تہذیب بنی ہے اس کو ہند اسلامی تہذیب کہتے ہیں، مشترک تہذیب یعنی گنگا جمنی تہذیب، قرۃ العین حیدر کا یہ بہت بڑا مسئلہ اور المیہ ہے کہ وہ سوال اٹھاتی ہیں کہ اس کی معنویت سے ہمارا رشتہ کیا ہے، اور اس کا تحفظ کتنا ضروری ہے۔ غورطلب یہ بھی ہے کہ وہ تہذیب کس طرح بنی ہے؟ ایک قوس قزح، ایک دھنک جس میں سارے رنگ ہیں۔ اسلام کے رنگ ہیں، ہندوازم کے رنگ ہیں اور دوسری قوموں کے بھی، اور ہماری زندگی کو وہ کس طرح ایک خاص ذائقہ، ایک لہجہ اور مزاج عطا کرتی ہے اور بعد کا جو برصغیر کا تاریخی عمل ہے تقسیم کے بعد اس پر کیا کوئی سوالیہ نشان لگے ہیں؟ اگر لگے ہیں تو وہ کس نے لگائے ہیں۔ کیا الجھنیں پیدا ہوئی ہیں؟ کیا ہم اپنی میراث کا تحفظ کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

ان تین چار بڑے ناموں کا جو میں نے ذکر کیا پریم چند کے بعد منٹو کو دیکھیے، اس کے پاس کوئی ناول نہیں صرف افسانے ہیں۔ کرشن چندر کو دیکھیے۔ ان کے پاس ناول ہیں مگر کوئی بڑا ناول نہیں، کوئی کلاسیکل ناول نہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے پاس کوئی ناول نہیں۔ صرف ایک ناولٹ ہے، 'ایک چادر میلی سی'۔ عصمت چغتائی کے پاس ناول ہے 'ٹیڑھی لکیر'، 'ضدی' وغیرہ۔ لیکن اگر آپ کہیں کہ پوری اُردو کی تاریخ میں تین بڑے ناولوں کا ذکر کریں تو ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ 'امراؤ جان ادا' کا نام لیں،

'گئودان' کا نام لیں لیکن 'آگ کا دریا' کسی فہرست سے خارج نہیں ہوگا۔ کوئی تین خاص ناولوں کا ذکر کیا جائے 'آگ کا دریا' لازماً ان میں شامل ہوگا۔ اور یہ اتنی بڑی بات ہے اگر 'آگ کا دریا' انھوں نے نہ لکھا ہوتا، جو ان کے اور کارنامے ہیں، اتنے بڑے بڑے ناول ہیں اپنی جگہ پر ہر ناول اپنی معنویت کے اعتبار سے اہم ہے۔

اب دوسری بات یہ کہ 'آگ کا دریا' اتنا مشہور ہوا کہ لوگ دوسرے ناولوں کو بھول گئے یا ان پر کم نظر جاتی ہے۔ لیکن 'گردشِ رنگِ چمن'، 'کارِ جہاں دراز ہے' کی دونوں جلدیں یا ان کے پہلے ناول 'سفینۂ غمِ دل'، یا جو ان کے بعد کے ناول ہیں 'آخرِ شب کے ہم سفر' یا 'چاندنی بیگم'، یعنی ہر ناول یا ناولٹ اپنی جگہ پر اہم کہانی کہتا ہے اور گہری معنویت رکھتا ہے، اور کسی نہ کسی بڑے مسئلے کو لے کر چلتا ہے۔ اور جو مسئلے قرۃ العین حیدر کے یہاں موج تہ نشیں کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ہیں انسان کا مقدر، زماں کا بھید، عورت کی مظلومیت۔ یعنی انسانی سماج میں عورت کا مقدر۔ علاوہ ازیں ایک پوری تہذیب کا پاش پاش ہونا۔ انسان کی زندگی وقت کے ہاتھ میں، یعنی زماں...... زماں کتنا بڑا جبر ہے جس میں انسانی وجود کے جتنے Shades ہوسکتے ہیں جبر و اختیار کے...... اور انسانی زندگی جس طرح سے متصادم ہوتی ہے تاریخ اور تہذیب کی قوتوں سے اور انسان کس طرح اپنے آئیڈیل تراشتا ہے، اپنا نصب العین متعین کرتا ہے، جدوجہد کرتا ہے۔ اُمنگیں ہیں، ہمت ہے، حوصلہ ہے، آرزوئیں ہیں، اضطراب ہے۔ ان ساری چیزوں کی جو کشمکش ہے وہ زماں کے مسئلے سے جڑ کر پُراسرار ہو جاتی ہے، اور سب سے بڑی بات ہے کہ ہر ناول اور ناولٹ ان کا اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ 'ہاؤسنگ سوسائٹی' کو بعض لوگ ناولٹ کہتے ہیں بعض لوگ طویل افسانہ کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں 'چائے کے باغ ہوں'، یا 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'، یا 'سیتا ہرن'، یا دوسرے ناولٹ یا افسانوں کے چار پانچ مجموعے ہیں یا جو رپورتاژ انھوں نے لکھے ہیں، جو تراجم کیے ہیں، ان کے کام کا...... Panorama اتنا وسیع ہے کہ اگر آدمی دو

تین گھنٹے بھی گفتگو کرے تو ساری باتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ زبان پر ان کو جو قدرت ہے، جو فضائیہ وہ طاری کرتی ہیں، شعور کی رو کے ذریعے کہاں کی پُراسرار بات کہاں جُڑ جاتی ہے۔ قدرت نے ان کو ایسا ذہن دیا ہے، ایسا غیر معمولی ملکہ ہے کہ جس وقت چاہے وہ کرداروں کو تراش سکتی ہیں۔ ان کا فکشن انسانی مقدر، زماں اور تہذیبی قوتوں کا ایک نگارخانہ ہے۔ علاوہ ازیں فضا کاری...... ان کی Photographic memory، جو زبردست ان کا حافظہ ہے، بچپن کی یادیں، عہد بلوغت کی یادیں، جس وقت چاہیں جیسا چاہیں زمانے کی فضاسازی، جُزیات نگاری کرتے ہوئے، تہذیب کی فضاسازی کرتے ہوئے، معاشرت کی، گھریلو زندگی کی، انسان اور انسانی مقدر کے بارے میں جو سوال وہ اُٹھاتی ہیں وہ انتہائی پُراسرار فضاؤں میں لے جاتے ہیں۔

لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو ان کا World View ہے اور جو ان کا Value System ہے جو کسی ثقافت یا سماجی طبقہ کے طرز عمل کے اچھے یا بُرے پہلو کی طرف لے جاتا ہے وہ Value System ان کے یہاں ایک کشادگی کی طرف لے جاتا ہے۔ آپ ان کا کوئی فکشن پڑھیں، It will liberate you یہ آپ کو، پوری انسانیت کو Liberate کرتا ہے۔ اور جو Human Values ہیں انسانیت کی، انسان دوستی کی Humanitarian Values، جو لب لباب ہیں صدیوں کے انسانی ارتقا کا کہ انسان ہر دوسرے انسان کی قدر کرے، ایک دوسرے کے خیالات کی قدر کرے۔ اس میں کشادگی ایک طرح کی وسعت ہے ایک طرح کا Liberalism ہے یعنی ایک طرح کا محض برداشت کرنا دوسرے کے نقطۂ نظر کو۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے کے نقطۂ نظر کا احترام کرنا، اس کے آزادی کے حق کا احترام کرنا۔ یہ بنیادی کشادگی ہے ان کے Value System میں۔

انسان کی سب سے بڑی قدریں انسانیت کی خدمت، محبت، ایثار، قربانی، امن، وحدت، یہ ساری انسانی بنیادی قدریں ہیں۔ ان کی روشنی ان کے فکشن میں چھائی

ہوئی ہے۔ زندگی کی بڑی قوتوں کے ٹکراؤ کے ساتھ اور انسان اور وقت کے درمیان جو تصادم ہر وقت جاری ہے، اور ایک تہذیب کے Panorama میں تہذیب کے بڑے پس منظر میں، تو قرۃ العین حیدر کا فکشن یا ان کی جو تاریخی حیثیت ہے ان کی حیثیت ایک بڑے Panorama سے کم نہیں۔ یہ بہت بڑی دین ہے خدا کی اور تاریخ کی اردو کو۔ یعنی آپ فخر محسوس کرتے ہیں یہ سوچ کر کہ آپ قرۃ العین حیدر کے ساتھ بیٹھے تھے آپ نے ان سے باتیں کی ہیں۔ یعنی ایسی ہستیاں تو روز روز سامنے آتی نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اب نہ ہمارے پاس نہ پریم چند ہیں نہ منٹو ہیں، نہ بیدی، نہ کرشن چندر، نہ عصمت چغتائی ہیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر کا جو اس وقت کا فکشن کا سفر ہے وہ ان کے قلم میں آ کر ایک طرح سے مجسم ہو گیا ہے۔ اس وقت جو تاریخ بن رہی ہے فکشن میں وہ ان کی ذات سے، ان کے کام سے اور ان کی تخلیقات سے...... ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی کیا تعریف کی جائے، جو کچھ بھی کہوں گا آخری جملہ یہ کہوں گا، کوئی بھی تعریف ان کے فن کے بارے میں، ان کی تخلیقات کے بارے میں، زبان پہ ان کو جو قدرت ہے، جس طرح سے انسانی زندگی کا المیہ اور وقت کا اور تہذیب کے تصادم کا المیہ ان کی تحریروں میں اُبھرتا ہے اور جس طرح یہ کبھی کبھی مزاح سے کام لیتی ہیں اور Language کے ساتھ ساتھ Anti language سے بھی کام لیتی ہیں، اگر ان سب چیزوں کو دیکھیں تو اس وقت بلکہ پورے اردو فکشن کی تاریخ میں کوئی دوسری نظیر ایسی دکھائی نہیں دیتی۔

یاور عباس : نارنگ صاحب نے جو کچھ فرمایا اُس کے سحر میں ہم سب کھو گئے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں مجھے کتنا فخر ہے کہ مجھے ان سے قربت حاصل ہے اور ...... قرۃ العین حیدر کو میں ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ ایک اور چیز شاید آپ اس سے اتفاق کریں گے نارنگ صاحب Genius کا Definition خداداد تو ہوتا ہے ایک Genius کا Definition یہ بھی ہوتا ہے...... کہیں انگریزی میں پڑھا ہے میں نے کہ

It is the capacity for taking pains یعنی اس قدر تحقیق کرنا، لکھنے میں کوئی محنت نہ اٹھا رکھنا...... یعنی قلم برداشتہ تو لوگ لکھتے ہی ہیں، ان کے قلم میں اتنی قوت ہے کہ یہ دونوں سب کچھ قلم برداشتہ لکھ سکتے ہیں۔

کہیں 'کارِ جہاں دراز ہے' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی اسٹوڈیو گئیں جہاں کوئی پروگرام ہو رہا تھا اور جو صاحب Play لکھنے کے لیے معمور کیے گئے تھے وہ غائب ہو گئے تھے۔ یہ کاریڈور میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ جلدی سے لکھ دو۔ کوئی آدھے گھنٹے کا Play تحریر فرما دیا۔ تو یہ قلم برداشتہ بھی لکھ سکتی ہیں۔

وہ اس قدر محنت و کاوش کرتی ہیں اپنے لکھنے پر کہ وہ ان کا صحیح Genius ہے۔ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی ہیں۔ ان کی تحقیق بالکل اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے۔ اور میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں اس گفتگو کے بعد جو نارنگ صاحب نے کی کہ یہ خداداد چیز تو ہے آپ میں اور محنت بھی آپ بہت کرتی ہیں لیکن یہ وراثت والدین سے بھی ملی ہے۔ اپنے ماحول سے ملی ہے۔ آپ کے والد سجاد حیدر یلدرم ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ آپ کی والدہ نذر سجاد حیدر اپنی جگہ خود ایک ادیب تھیں اور حامی تھیں آزادیِ نسواں کی۔ یہ ماحول تھا آپ کا۔ یہ گنگا جمنی تہذیب جس کا نارنگ صاحب تذکرہ کر رہے تھے۔ میں چاہتا ہوں عینی کہ تم اپنے بچپن کی یادیں ہمیں بتاؤ۔ کس قسم کے ماحول میں تم نے آنکھیں کھولیں، کس قسم کی زندگی، بچپن کا زمانہ جس کی چھاپ موجود ہے جگہ جگہ تمہاری کتابوں میں، یہ کس قسم کا تھا؟

قرۃ العین حیدر : اب اس وقت تو پوری طرح یہاں بتانا مشکل ہے۔ لیکن یہ تہذیب تو خاص...... جو ماحول تھا ہمارا وہ 1947 تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو چکا تھا۔ یہ تھا بنیادی طور پر برطانوی کولونیل ہندستانی معاشرہ۔ اور اس میں اس کی جو Strength ہے ایک تو وہی گنگا جمنی تہذیب جس پر نارنگ صاحب نے کھل کر کہا، اس پہ جو چھاپ پڑی وہ وِکٹورین تہذیب تھی۔ وِکٹورین جو خاص طور پر 1857 کے بعد، اور علی گڑھ

تحریک کے بعد جو ایک خاص قسم کی طرزِ معاشرت پیدا ہوئی جس میں ایک خاص قسم کا سمجھوتہ کیا گیا مغربی تہذیب سے۔ مطلب مغربی تہذیب سے اور ہندستانی...... یعنی ہندستانیوں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر، گویا ایک خاص طبقہ...... مثال کے طور پر سول لائن طرح کی کوٹھیوں میں رہنے لگا۔ ان کوٹھیوں میں پیچھے صحن بنایا لوگوں نے۔ دیوان خانہ بھی ہوتا تھا۔ ڈرائینگ روم جو تھا وکٹورین اور پیچھے بالکل مغلیہ اسٹائل کا مکان۔ تو یہ گنگا جمنی طرزِ معاشرت تھا وہ 1857 سے پہلے ہمارے یہاں آ گیا تھا۔

آپ پرانی کوٹھیاں دیکھیے۔ پُرانی کوٹھیاں اب بھی موجود ہیں۔ مجھے مسلم آرکیٹیکچر میں بہت دلچسپی ہے۔ تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ طرزِ تہذیب ہمارے ہاں تقریباً لارڈ ہیسٹنگ کے زمانے سے آیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہندستانی تہذیب میں جو انگریزی کولونیل تہذیب تھی شامل ہوئی۔ اور اس نے جس سوسائٹی کو جنم دیا میرا تعلق اُس سوسائٹی سے ہے۔ اس سوسائٹی کے بیک گراؤنڈ میں بنیادی طور پر...... یعنی جو زمیندار طبقہ تھا اس کے نوجوانوں نے خاص طور پر علی گڑھ سے...... میں اس لیے کہوں گی کہ علی گڑھ کا ہماری تہذیب میں بہت اہم رول رہا ہے۔ یہ فیوڈل اثر...... بھی تھا...... ترقی کا اور ایک خاص قسم کا...... بھی تھا۔ علی گڑھ سے پہلے اور علی گڑھ کے بعد۔ تو اس میں، اس تہذیب میں جو ایک رواداری تھی جس کا ذکر ابھی آپ نے کیا اور ایک خاص Receptive یعنی وہ Reject نہیں کر رہے تھے۔ وہ قبول کر رہے تھے۔ ہمارے یہاں اب یہ ہو گیا ہے کہ ایک طبقہ ہے جو Reject کر رہا ہے بجائے قبول کرنے کے۔ مسترد کر رہا ہے۔ یعنی ایک Negative عمل ہو رہا ہے۔ تو وہاں اس وقت وہ Receptive تھا، جس میں شامل کرتے تھے وہ ہندستانی تہذیب اور کولونیل تہذیب اور جو اسلامی اقدار تھیں۔

اچھا اس وقت مسلمانوں کا جو آئیڈیل تھا وہ ٹرکی تھے۔ ٹرکی کا یہ تھا کہ وہ واحد ایشیائی طاقت تھی جس نے ابھی تک برطانوی Imperialism کے سامنے گھٹنے نہیں

ٹیکے تھے۔ اور برٹش اور یوروپین طاقتیں جو تھیں وہ اس کو ملیامیٹ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ لیکن انھوں نے ایک الگ رویہ اختیار کیا تھا۔ انھوں نے اپنی ٹرکی تہذیب بھی رکھی تھی، عثمانی اور یوروپین، خصوصاً فرانسیسی تہذیب۔ تو ان کے یہاں دو Haram link اور Islam link، جس میں یوروپین فرانسیسی تہذیب کا جو مظاہرہ ہوتا تھا وہ ان کے باہر کے دیوان خانے میں ہوتا تھا جہاں پیانو بھی رکھا ہوتا تھا اور اندر حبشی غلام بھی تھے۔ زنان خانے میں حبشی کنیزیں تھیں۔ تو یہ تہذیب ان کے پاس 1914 تک رہی۔ اور چونکہ وہ یوروپ کے مداح تھے اس لیے یوروپین ادب کا گہرا مطالعہ...... نوجوان ٹرک کرتے تھے۔ ہمارے ہاں Young Turks ایک Symbol بن گیا انھوں نے فرانسیسی ادب کو پڑھا اور وہاں کی تہذیب کو قبول کیا اور انھوں نے اپنے یہاں Young Turk movement ینگ ٹرک مومنٹ شروع کی۔ اس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنا لیا جس میں سرسید احمد خان بھی تھے۔ انھوں نے...... دیکھیے میں اس چیز کو ایک بڑا Symbol سمجھتی ہوں کہ انھوں نے ٹرکی ٹوپی کو علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے اپنا یونیفارم بنایا۔ ٹرکش...... ان کی شیروانی کے ساتھ تھی اور انگریزی جوتے تھے جس پر اکبرالہ بادی نے بھی طنز کیا تھا۔ تو یہ ٹرکی تہذیب جو تھی...... یوروپین، ٹرکش، برٹش، کولونیل اور انڈین ان سب کا ایک معجون مرکب بن گیا تھا جس نے ہماری پچھلی دونسلوں کو متاثر کیا...... اس کے وہ پروردہ تھے۔ لہٰذا جس ماحول میں میں پیدا ہوئی ہوں وہ یہی ماحول تھا۔ ہم لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جس کو آپ Upper middle class کہہ لیجیے اور جس کا بیک گراؤنڈ فیوڈل تھا، کوٹھیوں میں رہتے تھے لیکن اپنی تہذیب کو بھی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ یعنی وہ بالکل براؤن صاحب نہیں بنے تھے۔ براؤن صاحب جو بنگال کا ایک طبقہ بنا تھا اس کا اکبرالہ آبادی نے بہت مذاق اڑایا۔ لیکن جس طبقہ میں...... ہندوؤں نے بھی اور مسلمانوں نے بھی ایک Compromise کی حیثیت سے مغربی تہذیب کو قبول کیا، اس تہذیب سے میرا تعلق

ہے۔ جس میں ہم نے ان کے اچھے پہلو، مثال کے طور پر عورتوں نے پردہ چھوڑا۔ میری والدہ...... سب سے پہلے جن خواتین نے پردہ ترک کیا اس میں میری والدہ شامل تھیں اور علی گڑھ گویا اس کا سینٹر تھا۔ 1920ء میں میری والدہ نے پردہ ترک کیا۔ اور اس لیے کیا کہ وہی...... ٹرکی اثرات تھے۔ تو ہر چیز میں ہمارے بزرگوں کا آئیڈیل ٹرکی تھا۔

جب مصطفیٰ کمال پاشا نے جو اس وقت اتاترک بن چکے تھے، ان کی قوم نے پاشا کا لقب ہٹا کر اتاترک کا خطاب دیا تھا، انھوں نے باقاعدہ ایک ڈگری کے ذریعے پردے کی رسم کو ختم قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں جو پردہ ترک کیا گیا، یہاں میرے والد نے اماں سے کہا، میری والدہ سے کہا، اب تم بھی پردہ چھوڑ دو۔ اماں ویسا بُرقعہ تو پہنتی نہیں تھیں روایتی۔ انھوں نے ایک اور بُرقعہ ایجاد کیا تھا جو کہ گاؤن نما قسم کا، یعنی میری والدہ اور ان کی ساتھی جو خواتین تھیں وہ بھی اپنے طریقے سے ایک Forward looking، یعنی ان کا جو بھی آئیڈیل تھا وہ یہ تھا کہ لڑکیاں، ہندوستان کی لڑکیاں تعلیم حاصل کریں اور پردہ اور قدامت پسند رسم و رواج ترک کریں۔ ہمارے ہاں خواتین کے لکھے ہوئے ناول دیکھیں، افسوس یہ ہے کہ ہم ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ ان میں سے بعض بہت اچھے ناول ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خواتین جنھوں نے ناول لکھے ان کی کتنی گہری نگاہ تھی اور گہرا مشاہدہ تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ عورتیں اپنی ڈگر کو چھوڑے بغیر...... چنانچہ اماں اور ان کے ساتھ کی اور جو خواتین ناول نگار تھیں، ان سب کو دیکھیے۔

اماں کے ہاں جو ہیروئن ہے، ان کی ہیروئن ثریا میڈیکل کالج لاہور میں...... زمانہ 1910 کا ہے۔ اماں نے اپنی ہیروئن کو لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ یہ بڑی قابل ذکر بات ہے۔ وہ لڑکی پردہ نہیں کرتی ہے۔ نقاب نہیں پہنتی ہے۔ لہٰذا کالج جانے سے پہلے چہرے پر ایک سیاہ رنگ کا پاؤڈر لگا لیتی ہے

تاکہ بدشکل نظر آئے۔ ہیروئن بہت خوبصورت ہے۔ ساری ہیروئن بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ سیاہ رنگ کا پاوڈر لگاکر میڈیکل اسکول جاتی ہے اور ڈاکٹری پاس کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسری ہیروئن ہے وہ بھی ڈاکٹری پاس کرتی ہے۔ وہ سب کالج میں پڑھتی تھیں۔ سب پیانو بجاتی تھیں۔ اب اس میں یہ دیکھیے اس میں کلاس کا مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی اس میں Class consciousness نہیں آئی ہے۔ تو ہمارا دور تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ سب ایک طبقے کی بات کر رہے ہیں جو کہ لیڈر تھا ہماری سوسائٹی کا۔ اور وہ طبقہ گویا تعلیم کے میدان میں بھی اور سیاست...... دونوں میں جو نئی مسلم کلاس...... اودھ میں جو کلاس تھی ان کے بارے میں وہ بات کرتی تھیں۔ ہمارے ہاں لوور مڈل کلاس اور گاؤں دیہات جو پریم چند نے شروع کیا، پریم چند کا ٹارگٹ اور ان کا Vision بالکل مختلف تھا۔ یہاں میں بات کر رہی ہوں ان کی جو کہ Urban تھے، جو کلاس کی ترقی اور تعلیم کے حامی تھے۔ جس کو لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے ذریعے ہی ہندوستان کی ترقی ہوگی۔ لہٰذا اماں کی ہیروئن مثالی ہے۔ پیانو بجاتی ہے۔ شام کو جو ہیرو ہیں وہ Straw hat پہن کے گاڑی میں بیٹھ کے ہواخوری کے لیے جاتے تھے۔ یہ خاص ان کا آئیڈیل تھا۔ ایک نہایت Civilised مہذب برطانوی Liberal ideal جس نے کہ اپنے آئیڈیل اخذ کیے ہوں۔ ایک نہایت مہذب مڈل کلاس معاشرہ جو کہ نئے ہندوستان کی قیادت کرنے والا تھا۔ اب یہ اُس وقت کا ماحول تھا۔ یہ ان کا نظریہ تھا اور یہی اُن کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر میرے والد کا ایک افسانہ ہے 1905 کا، جس میں دو لڑکیاں ہیں۔ ایک حیدرآباد کی ہے اور ایک کہیں اور کی۔ اور وہ کہتی ہے...... ایک لڑکی پیانو بجاتی ہے۔ پیانو سیکھا ہے اس نے۔ جو گورنس ہے وہ انگریز ہے، اور دوسری لڑکی معلمہ ہے۔ اس کی شادی ایک بہت ہی پرانے خیال کے نواب سے ہوجاتی ہے۔ تو اب یہ معاشرہ جو وہ دکھا رہی تھیں، پیدا ہو چکا تھا...... مسلمانوں میں بھی کچھ لڑکیاں، کچھ خاندان ایسے تھے حیدرآباد میں، لکھنؤ میں، اور جگہ،

کہ لڑکیاں پیانو بجا رہی تھیں۔ اچھا وہ گویا نئی تہذیب کی علمبردار تھیں۔ اور اُس فکشن میں بھی اُس کا تذکرہ ہوتا تھا۔

پریم چند سے پہلے جو خواتین تھیں وہ ازدواجی محبت یعنی Love marriage۔ یہ میرے والد کا افسانہ ہے 1905 کا جس میں کہ Love marriage کے آئیڈیا کو پیش کرتے ہیں۔ اور اس میں جو ہیروئن ہے وہ کہتی ہے...... وہ شادی کرتی ہے اپنی مرضی سے۔ اب 1905 میں یہ افسانہ لکھا گیا ہے جو...... اپنی مرضی سے شادی کرنا یا لڑکیوں کا پردے سے باہر نکلنا ہی بالکل خواب وخیال تھا۔ اور اُس میں وہ کہتی ہے، میں چاہتی ہوں کہ جو میرا پیسہ ہے...... سب امیر ہوتی تھیں، میں اپنے پیسے سے ایک ویمن یونیورسٹی قائم کروں گی۔ اب ویمن یونیورسٹی قائم کرنے کا یہ آئیڈیا یہ خیال 1905 کے افسانے میں آتا ہے۔ تو یہ لوگ اپنے وقت سے آگے دیکھ رہے تھے۔ اور میں نے اس کے بعد جب علی گڑھ یونیورسٹی بن چکی تھی اور...... جب میں پیدا ہوئی ہوں، جس معاشرے کی تشکیل میں یہ لوگ مصروف تھے، جس کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے، ہمارے والد تھے، ان کے دوست رائٹر تھے، قاضی عبدالغفار، پریم چند... وہ تو بالکل الگ ہیں۔ لیکن وہ میرے والد کے دوستوں میں تھے...... اور نواب نفیس احمد خیال......

یاور عباس: بہرحال اس ماحول میں تم نے آنکھیں کھولیں۔

قرۃ العین حیدر: نہیں یہ تو بہت بزرگ لوگ تھے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں۔ لیکن جس ماحول میں میں نے آنکھ کھولی یہ سب Forward looking ماحول تھا۔ لیکن جو اپنی Roots سے نہیں کٹنا چاہتا تھا۔ اور میرا جو پورا مزاج ہے وہ بھی ایسا ہے کہ میں اچھی خاصی قدامت پسند بھی ہوں اور ماڈرن بھی ہوں۔

یاور عباس: اب ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ جس ماحول میں تم پیدا ہوئیں ایک ادبی ماحول تھا۔ Pioneering ماحول تھا اور بڑا بیدار ماحول تھا۔

اس میں ایسا لگتا ہے جیسے بطخ کے بچے جس طرح تیرتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں تم بھی شاید لکھتی ہوئی پیدا ہوئی ہو۔

قرۃ العین حیدر : جی ہاں۔

یاور عباس : بچپن سے لکھ رہی ہو؟

قرۃ العین حیدر : جی ہاں۔

یاور عباس : سب سے پہلی یاد تمہاری، تم نے کس سنہ میں لکھنا شروع کیا۔ کس وقت تم کو احساس ہوا کہ تم لکھ سکتی ہو یا لکھنا چاہتی ہو۔

قرۃ العین حیدر : دیکھیے ایک چیز اور تھی جس کو کہ آج کل کے جو لوگ Genius ہیں ان کو یہ آئیڈیا نہیں ہوگا کہ وہ ایک بہت Literature oriented society تھی۔ ہر گھر میں اردو رسالے آتے تھے۔ عورتوں کے رسالے آتے تھے؛ 'تہذیب نسواں'، 'عصمت'، اس وقت بچوں کا رسالہ 'پھول'...... میری والدہ اس کی ایڈیٹر رہی ہیں۔ 1910 میں تو ہمارے گھر بچوں کا رسالہ آتا تھا 'پھول'۔ اب لکھنا جو تھا وہ ایک تہذیبی مشغلہ تھا۔ یعنی لکھنا بچوں کو سکھایا جاتا تھا۔ بچوں کو بیت بازی، سخن فہمی...... یہ سب چیزیں اردو کلچر میں شامل تھیں۔ تو اب میرے گھر میں 'پھول' رسالہ آتا تھا اور میری کزن کے پاس 'تہذیب نسواں' میری والدہ منگواتی تھیں۔ اور یہ تو گھر کے رسالے تھے۔ بچپن میں میں نے لکھنا شروع کیا۔ 1938 میں جب میں چھوٹی تھی اُس وقت میں بچوں کی کہانیاں لکھتی تھی۔ میں نے چھوٹی چھوٹی کتابیں بنائی تھیں گڑیوں کو پڑھانے کے لیے۔ میں نے گڑیوں کا اسکول کھولا تھا۔ تو میں......!

یاور عباس : اچھا تو پھر یہ ہوا۔ میں نے دیکھا عینی کہ تم جس معاشرے کی پیداوار تھیں...... لیکن تمہاری کہانیوں میں، ناولوں میں قصبوں کے اور دیہاتوں کے بھی بڑے اچھے مرقعے ملتے ہیں۔ میرا خیال ہے تمہارے والد دوروں پر جاتے تھے۔

قرۃ العین حیدر : جی ہاں۔

یاور عباس : حافظہ تو کمبخت تمہارا غضب کا ہے۔ اس کے بعد تم نے خود بھی ایک شعوری کوشش کی ہے اپنی Roots دریافت کرنے کے لیے اپنے خاندان کے حالات دریافت کرنے کے لیے۔ جگہ جگہ گاؤں گاؤں...... یہ جو دوسرے تاثرات ہیں یہ بھی بھرپور تمہاری کتابوں میں آئے ہیں ذرا اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔

قرۃ العین حیدر : دیکھیے بات یہ ہے کہ میرا اپنا جو خاندان ہے وہ صوبائی خاندان ہے۔ میں بہت چھوٹے قصبے بجنور کی پیروی کرتی ہوں۔ ہم برابر وہاں جاتے رہے بچپن سے۔ وہ ماحول زمینداری کا ماحول تھا وہ ماحول بہت اچھی طرح دیکھا بھالا ماحول ہے۔ اور اس کے بعد...... گاؤں جاتے تھے والد کے ساتھ دوروں پر۔ تو اس کا مجھے بڑا Fascination ہے آم کے باغوں کا۔ آم کے باغ میں۔ آج ہی کسی Country side سے گزر رہی تھی۔ جنگل میں نے دیکھے تو مجھے خیال آیا یہ جنگل، ہندوستان کے جنگل اتنے دل آویز ہیں خصوصاً موسمِ خزاں میں یا Fall میں امریکہ میں۔ لیکن یہاں بیٹھ کے میں کبھی محسوس نہیں کر سکتی، وہ کیفیت اور وہ اپنائیت، اپنا ملک اور وہ اپناپن ایک عجیب چیز ہے یہ، یوپی کے کسی آم کے باغ میں دوپہر میں بیٹھنے کی۔ اب کیفیت جو ہے آم کے باغ میں دوپہر میں بیٹھنے کی، کوئل کی آواز آ رہی ہے رہٹ چل رہا ہے۔ یہ وہ چیز ہے Sense of belonging۔

تو میں نے وہ بھی دیکھا ہے۔ باہر کے ملکوں میں دوسری تہذیبوں سے میرا...... لیکن ایک چیز میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں تہذیبوں کے ٹکراؤ کی قائل نہیں ہوں۔ میں تہذیبوں کے میل ملاپ کی قائل ہوں۔ میں سمجھ ہی نہیں سکتی کہ لوگ Agitated کیوں ہوتے ہیں۔ دوسروں کی تہذیب سے خائف کیوں ہوتے ہیں یا متعصب ہوتے ہیں یا ڈرتے کیوں ہیں، متنفر کیوں ہیں۔ یہ میں سمجھ نہیں سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ جتنی تہذیبیں ہیں سب ہندوستان کی تہذیبیں ہیں، پاکستان کی تہذیبیں ہیں۔ میں پاکستان میں بہت جگہ رہی ہوں۔ تمام سندھ میں، پنجاب میں اور بنگلہ دیش میں۔ ایسٹ پاکستان میں

گاؤں میں گئی ہوں۔ ہندوستان میں بے شمار علاقوں میں، گاؤں میں جا کر رہی ہوں۔ اور مجھے وہی اپنا پن محسوس ہوا۔ مجھے کوئی چیز الگ نہیں لگی تو کیوں نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ کیوں نہ ان کا ایک وسیع تر خزانہ بنا دیا جائے۔ Emotional جذباتی Attachment کا اور ذہنی رابطے کا۔ ہم اپنے آپ کو خانوں میں بانٹ لیتے ہیں اور ہم کچھ Defensive ہو جاتے ہیں۔ یا پھر ہم خفا رہتے ہیں ان سے یا شک میں مبتلا رہتے ہیں۔ شک میں شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ میں سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

یاور عباس : اس کا ایک بیّن ثبوت تمہاری کتابوں میں ملتا ہے کہ تقسیم جو کہ ایک بہت Traumatic چیز تھی، بہت پریشان کن، اس نے اتنی زبردست عصبیت پیدا کی، جسمانی عصبیت، جذباتی عصبیت بھی۔ اس کے باوجود تم نے پاکستان کے بارے میں بہت محبت سے لکھا ہے۔ ہندوستان کے بارے میں بہت محبت کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب بھی بری طرح مجروح ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود تمہاری رائٹنگ میں کہیں بھی......

قرۃ العین حیدر : تلخی......!

یاور عباس : تلخی نہیں آئی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تم نے اپنا ذہن بہت وسیع کیا۔ تم تمام تر اونچی کھڑی ہو۔

قرۃ العین حیدر : شاید کچھ ہمارے مزاج میں بھی ہے کہ ہمارے یہاں جو تصوف کا جو ہمارا بیک گراؤنڈ ہے اس میں بھی ہم چیزوں سے نفرت نہیں کرنا چاہتے۔ ہم چیزوں سے محبت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو تصوف کا بنیادی...... وہ ہے۔ میرے خاندان میں صوفیوں کا بہت دخل رہا ہے۔ اس کے لیے شاید اس کا بھی......

یاور عباس : تمام دنیا میں گھومتی پھرتی ہو۔ جاپان گئی ہو، امریکہ گئی ہو، لندن بھی کئی مرتبہ آ چکی ہو۔ لندن میں تم نے کام بھی کیا ہے۔ بی بی سی کے لیے بھی مدت سے

لکھ رہی ہو۔ ذرا اس زمانے کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ لندن کے بارے میں۔

قرۃ العین حیدر : وہ اتنا پُرانا زمانہ ہے کہ اس کی... بھئی ہر ایک کو اپنا پرانا زمانہ اچھا لگتا ہے۔ ہمارا زمانہ بہت پرانا تھا۔ سب 1955 ,1954 ,1953 ,1952 کا وہ زمانہ آج تک اتنا خوبصورت...... ایک پوری جنریشن اس کے بعد آ گئی۔ تو وہ طوفان نوح سے پہلے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ غرض کیا بتاؤں آپ کو۔ لندن وہی ہے، عمارتیں وہی ہیں۔ لوگ بدل گئے ہیں اور ماحول وہی ہے۔ اب یہاں دعوت ہو رہی ہے۔ تو اس وقت اتنے لوگ نہیں تھے۔ ہندستانی اور پاکستانی دو چار لوگ مل بیٹھتے تھے اور اسی میں دعوتیں ہوتی تھیں۔

یاور عباس : عینی یہ سوال پہلے بھی کیا تھا۔ کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔ 1950 کے لندن میں اور اب کے لندن میں؟

قرۃ العین حیدر : بڑا مشکل ہے کہنا۔ یہ دوسری جنریشن آ گئی ہے۔ ان سے ہمارا اور ہمارا ان سے کچھ فاصلہ معلوم نہیں ہوتا لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ ہماری جنریشن کس طرح سوچتی تھی...... بڑا مشکل ہے۔

یاور عباس : تم کرتی کیا تھیں؟

قرۃ العین حیدر : ہاں میں نے لندن میں مختلف ماحول دیکھے۔ اسکول آف آرٹ میں کچھ دنوں کام کیا۔ پھر زیادہ تر جو میں نے کام کیا Fleet Street میں ڈیلی ٹیلیگراف اخبار میں میں نے کچھ دنوں کام کیا، پھر میں بی بی سی میں Casual Broadcaster تھی۔ ویسے میں نے ٹِک کر کوئی کام نہیں کیا۔ بہت Haphazard، میں نے Organised زندگی نہیں گزاری۔

یاور عباس : میکبتھ میں تم نے بہت زبردست کردار ادا کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر : چڑیل کا۔

یاور عباس : بہت اچھا زمانہ تھا وہ۔

قرۃ العین حیدر : عطیہ ہماری براڈ کاسٹر تھیں اور احمد صدیق تھے۔ وہ اس کی ایک Myth ہے۔ میں نے خود اس کی ایک Myth بنالی ہے اس زمانے کی۔ ہم خود تخلیق کرتے ہیں۔ Myth کہیں اوپر سے نہیں آتی ہے۔ ہر شخص جو ہے اپنے کالج کے زمانے کو بڑا...... میں اپنا زمانہ یوپی لکھنؤ یونیورسٹی کا، وہ اب دیکھیے پچاس سال بعد دیکھیے تو بڑا...... اب آج جا کے کالج کو دیکھیے، لڑکیوں کو دیکھیے تو...... میں اس کالج میں پڑھتی تھی۔ تو وہ Myth بناتا ہے۔ اور Myth انسان کی مختلف جو Experiences ہوتی ہیں وہ ایک Myth بناتی ہیں۔ وہ ختم ہو جاتی ہے پھر ایک اور بن جاتی ہے۔

یاور عباس : لیکن جو لکھا ہے تم نے وہ Myth نہیں ہے حقیقت ہے۔

قرۃ العین حیدر : ہاں وہ Myth نہیں ہے حقیقت ہے لیکن اس کی Myth بن گئی۔ اس کی ایک Different quality بن گئی۔ اسٹوری کوالٹی بن گئی۔ معمولی واقعہ لیجیے۔ سال بھر بعد اس کے بارے میں افسانہ لکھیے۔ وہ واقعہ معمولی نہیں رہ جاتا وہ افسانہ بن جاتا ہے۔

یاور عباس : اس کے بعد تم لندن واپس بھی گئیں۔ پاکستان بھی گئیں۔

قرۃ العین حیدر : میں بہت جگہ گھومتی ہوں۔ کافی گھومتی ہوں پاکستان میں میں نے خوب کام کیا ہے۔ وہاں دیکھا بھی ہے میں نے۔ گاؤں گاؤں گھومتی رہی ہوں۔ گردش میں...... تو وہاں کا میں نے افسانہ لکھا ہے۔ لیکن اب ایسٹ پاکستان...... اور انڈیا میں بھی کافی گھومتی ہوں۔ گھومنے سے انسان کی صحت اچھی رہتی ہے۔ (ہنسی)

یاور عباس : اور پھر ہندوستان جا کر تم نے جرنلزم بہت تیزی سے شروع کیا۔ فرینڈ کے لیے ایڈیٹر......

قرۃ العین حیدر : فرینڈ میں Enter ہوئی اور فرینڈ میں آٹھ نو سال رہی پھر سنسر بورڈ فلم سینٹر میں رہی بمبئ میں۔ صبح شام فلم دیکھنے پڑتے تھے۔ Certify کرنا۔ تو کیا فرق پڑتا ہے، پہلے سے اور اب تک۔ تو Morality میں بہت فرق آیا ہے۔ 1972،

1973، 1974، 1975، 1976، تو Finally میں کہتی تھی کہ اس فلم کو پاس کیجیے۔ تو میں نے بعض فلم میں ایسے سین ریجکٹ کیے۔ بھئی Powerful لوگ جو ہیں راج کپور ...... اس میں ایک سین یہ تھا۔ فلم میں ریکھا کی پیٹھ کیمرے کی طرف تھی اور اس نے بہت Low cut بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس چیز کو ریجکٹ کر کے کٹوایا ہی نہیں بلکہ کہا کہ پوری فلم Erase کیجیے اس لیے کہ ریکھا اس فلم میں بہت Vulgar لباس میں آئی تھی۔ راج کپور آئے، انھوں نے مختلف ذریعے سے کہلوایا، ڈبو آپا، آنٹی آنٹی آپ......تو اس کے بعد آج اس بات کو بیس پچیس سال ہو گئے۔ اب جس طرح کی فلمیں دکھائی جارہی ہیں تو کتنا بڑا اب انقلاب آگیا ہے۔ یعنی ہمارے دیکھتے دیکھتے انقلاب آیا۔ کہتے ہیں فرق محسوس کرنے کی بات ہے۔ Morality کا مذاق بن گیا کم از کم بڑے شہروں میں۔ تو ہماری جو ہندستانی اخلاقیات، جو پابندیاں تھیں ان میں تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں۔

یاور عباس : یہی نہیں بلکہ تم فلمیں بھی بناتی رہی ہو۔

قرۃ العین حیدر : جی ہاں میں نے فلمیں بنائیں۔ ڈاکیومنٹری بنائی تھیں اور ایک فیچر فلم کے لیے ڈائیلاگ لکھے، ایک مسافر ایک حسینہ کے لیے بمبئی میں۔

یاور عباس : تم کو کبھی خیال آیا کہ 'آگ کا دریا' پر فلم بنے۔

قرۃ العین حیدر : میں نے جو فلمیں بنائیں...... خیال کیا آتا۔ لوگوں نے اس کو بنانے کی بہت کوشش کی۔ ہندی میں بھی فلم بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی فلم نہیں بن سکی۔

یاور عباس : اچھا یہ جو تم کتابوں کے نام چُنتی ہو، 'پت جھڑ کی آواز'، 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'ستاروں سے آگے'، 'گردشِ رنگِ چمن'، 'سفینۂ غمِ دل'، 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو'۔ یہ کیسے پیارے پیارے نام ہیں۔ یہ کیسے آتے ہیں تمہارے ذہن میں۔

قرۃ العین حیدر : جیسے اور بہت ساری باتیں آتی ہیں۔

یاور عباس : بہت خوب۔ ہاں لیکن وجہ تسمیہ بتاؤ۔

قرۃ العین حیدر : اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو جو میں نے کہانی لکھی تھی وہ لکھنؤ کی چکن کاڑھنے والیوں کے بارے میں ہے۔ ظاہر ہے وہ بہت Soft soft stuff ہے۔ تو وہ کہانی لکھنؤ کا جو لوک گیت ہے، ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو، چاہے نہ روئیو......'' تو وہ تو میں نے اُس سے لیا ہے۔ اور 'کارِ جہاں دراز ہے' اقبال کا ہے، 'سفینۂ غم دل' فیض کا ہے۔ میں فیض صاحب سے کہتی تھی فیض صاحب آپ کوئی ایسا نیا شعر لکھیے کہ میں اسے اپنے ناول کا عنوان بنالوں۔

یاور عباس : 'گردشِ رنگِ چمن'، 'اقبال'، 'پتھر کی آواز'...... اچھا عینی یہ بتاؤ اتنی کتابیں لکھیں، اتنے افسانے لکھے، اتنے رپورتاژ لکھے......

قرۃ العین حیدر : میرے کام کچھ نہ آیا۔ یہ کمال ہے میرا۔

یاور عباس : یہاں پر مغرب میں ان کتابوں کا ترجمہ یا اشاعت کیوں نہیں ہوئی۔

قرۃ العین حیدر : مجھے خود نہیں معلوم۔

یاور عباس : نارنگ صاحب بتائیں گے۔

گوپی چند نارنگ : بھئی آپ پتہ کیجیے آپ مغرب میں بیٹھے ہیں۔

یاور عباس : وہ تو ہے۔ لیکن آپ کا مغرب کے اشاعت خانوں سے تعلق رہا ہے۔ یہاں کے لوگوں سے آپ کے کانٹیکٹ ہیں۔ منٹو کے بہت سے افسانے ترجمہ ہوکر مقبول بھی ہوئے ہیں لیکن ......

گوپی چند نارنگ : Main stream میں ابھی Penguin بھی آیا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، خاص طور پر پینگوئین فکشن زیادہ چھاپتا ہے۔

قرۃ العین حیدر : یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ......

گوپی چند نارنگ : منٹو کو زندگی میں تو عدالتوں کے چکر لگانے پڑے۔ مرنے

کے بعد شہرت ملی۔

قرۃ العین حیدر : منٹو کو مرنے کے بعد غضب کا پریس ملا۔

گوپی چند نارنگ : زندگی بھر تو مقدمے چلتے رہے۔ منٹو جن کے نام دیتا تھا مثلاً عسکری یا قاسمی، گواہی کے لیے وہ عدالت کے سامنے نہیں آتے تھے۔

یاور عباس : یہ جو تمہارے ساتھ ہیں گوپی چند نارنگ، ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔

قرۃ العین حیدر : پڑھے لکھے جن ہیں۔ جناتی کام بہت کرتے ہیں۔ اردو میں ایک محاورہ ہے پڑھے لکھوں کے لیے۔ یہ بہت اہم کام کرتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ : Compliment تشکر

قرۃ العین حیدر : بہت کام کرتے ہیں بہت کام کیا ہے انھوں نے۔ یہ واقعہ ہے کہ اپنی لائن میں بہت بلند آدمی ہیں نارنگ صاحب، مبالغہ آرائی اور دوست نوازی سے یہ بچتے ہیں۔ اس سے بچ کر نکلتے ہیں۔ ان کی Upbringing، ان کی ذہنی اور تہذیبی صلاحیت لاجواب ہے...... مغرب میں رہ کر بھی انھوں نے پڑھا اور پڑھایا ہے۔ انھوں نے Western criticism بھی پڑھا ہے۔ اردو ان کی مادری زبان نہیں۔ سرائیکی بلکہ بلوچی ہے اور اردو والوں سے بہتر اردو جانتے اور لکھتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ : بلوچی پشتو بھی ہے۔

قرۃ العین حیدر : جو بھی ہے زندہ زبان ہے۔ تو صاحب اردو یہ ایسی رواں دواں لکھتے ہیں کہ اہل زبان گرد ہیں ...... بہت ہی اسٹائل ہے۔ اور میں کیا بیان کروں۔ یہ بہت وسیع ہیں۔ یعنی ان کا کوئی ایک بندھا ٹکا مضمون نہیں ہے۔ یہ ہر موضوع پر بول سکتے ہیں۔ جمالیاتی تہذیبی ادب پر بات کرتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کو ملاتے ہیں۔

یاور عباس : آج کل انھوں نے ساختیات پر خوب لکھا ہے۔

قرۃ العین حیدر : ساختیات تو ...... یہ فلسفیانہ کتابیں تو میرے پلّے نہیں پڑتیں۔

انھوں نے بلاشبہ ساختیات کو Post Modernism کو اردو میں Introduce کیا ہے۔ اور یہ بہت زبردست علمی کام ہے۔ جدیدیت اور مابعدجدیدیت۔۔۔ وہ سب معلوم ہو جائے گا ان کو پڑھ کے۔ نئی روشنی کے آدمی ہیں۔

یاور عباس : خشک مضمون کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر : خشک مضمون فلسفیانہ مضمون بہت آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ وہ پیچیدہ زبان میں نہیں لکھتے۔ میں چند نقادوں کے نام لے سکتی ہوں لیکن نہیں لوں گی جو ایسی زبان لکھتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن نارنگ کو پڑھ کر ہم جیسے لوگ بھی جن میں تنقید کا شعور زیادہ نہیں ہے، سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ : موضوع دیجیے۔

یاور عباس : یہاں افتخار عارف مجھے یاد آرہے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کے ساتھ تقریب ہو رہی تھی تو اچانک ایک موضوع دیا گیا اور کہا گیا کہ اس موضوع پر تقریر کیجیے تو افتخار عارف نے کہا تھا اگر ان کو سوتے میں موضوع دیا جائے تو جاگ کر اس کا بھی حق ادا کر دیں گے۔

قرۃ العین حیدر : یہ واقعہ ہے۔ اور پھر خاص طور پر ان سے سُن لیجیے، میر انیس پر، اب یہ میر انیس پر ایسے ایسے نکتے نکالیں گے کہ کبھی آپ نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ کہاں سے کب پڑھا انھوں نے، کب تلاش کیا، کب اس کو سمجھا۔ میر انیس ان کا کلچر نہیں ہے۔ بھئی آپ کو کلچر میں ڈوب کر کچھ ملتا ہے۔ یہ اس کلچر میں ڈوب چکے ہیں اور یہ ایک بڑی بات ہے۔ غیر معمولی بات ہے۔

یاور عباس : اور عینی شاید انھیں کے لیے یہ محاورہ شاید ایجاد کیا گیا ہے......علم دریاؤ......

قرۃ العین حیدر : میر انیس یا اقبال یا کسی اور کے بارے میں آپ ان کو پڑھیں، کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں آپ بات کیجیے یہ جانتے ہیں کیا سیاق اور

سباق...... ان کا پھیلاؤ ہے۔ بڑے بڑے پڑھنے والوں اور سننے والوں کو ان کا بولنا لکھنا اچھا لگتا ہے۔ اور پڑھنے میں تو خیر کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کئی لوگ پہنچے ہوئے اچھے نقاد ہیں لیکن بول نہیں سکتے، Explain نہیں کر سکتے۔ ایک اور بات ان کے بارے میں عرض کرسکتی ہوں۔ اگر آپ چاہیں۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ یوروپ میں اس پائے کے Intellectual کو Renaissance Man کہا جاتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کو میں اردو کا Renaissance Man سمجھتی ہوں۔

مسز سلیم عالم : آپ سے ایک سوال ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کتاب جیسے 'سیتا ہرن' پڑھنے کے بعد کبھی آپ کو یہ احساس ہوا کہ سیتا کے کردار میں انھوں نے صرف ایک پہلو کو مدنظر رکھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ عورت کی کمزوری کو قرۃ العین حیدر نے زیادہ نمایاں کیا ہے۔

گوپی چند نارنگ : آپ سن رہی ہیں آپ پر الزام ہے کہ عورت کی کمزوری کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر : 'سیتاہرن' میں کمزوری کو نمایاں کیا میں نے؟

مسز سلیم عالم : جی مجھے ایسا ہی لگا۔

قرۃ العین حیدر : تو کیا۔ ٹھیک کیا عورت میں کمزوری......

مسز سلیم عالم : میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ نے کیوں کیا۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی کردار تخلیق کرنے کے بعد آپ کو احساس ہوا کہ میں نے اس کے ایک ہی پہلو کو اُجاگر کیا ہے اس کے اور بھی......

قرۃ العین حیدر : دیکھیے ایسا ہے کہ ہم ایک پہلو کو جو Dominating ہوتا ہے اسی کو پیش کرتے ہیں۔ اب میں کسی انسانی کردار پہ، عورت کے کردار پہ تو نہیں لکھ رہی تھی۔ میں تو ایک افسانہ لکھ رہی تھی جس میں اس عورت کے جو کمزور پہلو تھے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ بنیادی طور پر عورتیں جذباتی ہوتی ہیں۔ ان کی جذباتیت ان کی

ذہانت کے سامنے...... تو ایسا اثر ہوتا ہے تو میں نے وہی پیش کر دیا۔
سیّد حسن : عینی آپا آپ نے تصوف کا ذکر کیا۔ وہ جو آپ کی کتاب ہے گردشِ رنگِ چمن...... اس میں وجود کا جو ذکر ہے اس سے پہلی کتابوں میں اس طرح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ میں طنز یا مزاح کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ جس عمر کو پہنچی ہیں تو کیا آپ تصوف کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہیں۔
قرۃ العین حیدر : بہرحال تصوف کی طرف تو میرا رجحان ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں اور کتابیں بھی پڑھیں تو کہیں نہ کہیں تو آ جاتا ہے صوفیا کا ذکر۔ لیکن یہ چونکہ میں نے کیریکٹر پیش کیا ایک کہانی کا اس لیے میں نے اسے زیادہ تفصیل سے پیش کیا۔ اور میرے خیال میں وہ کافی اہم تھا کہانی کے لحاظ سے۔ وہ اس طرح کہ میں نے ایک اور جو ناول لکھا اس میں تصوف کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے بعد جو میں نے ناول لکھا...... کون سا ناول تھا...... اس میں ایک خاص ماحول پیش کیا تھا۔ لکھنؤ اور یوپی کے ضلعوں میں جو درگاہیں ہیں، خانقاہیں ہیں وہاں خانقاہی کلچر ہے درگاہی کلچر ہے وہ اب تک موجود ہے Intact ہے۔ اور اس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میں وہ پیش کرنا چاہتی تھی۔ وہ میں نے پیش کیا۔ مثال کے طور پر لکھنؤ میں شیعہ سنّی فساد ہوتے ہیں۔ لکھنؤ سے پندرہ میل دور بارہ بنکی میں سنّیوں کے ہاں زبردست محرم منایا جاتا ہے۔ زبردست تعزیہ داری ہوتی ہے۔ تو یہ تضادات ہیں ہمارے یہاں Urban کلچر میں جو کہ سیاست اور سیاستدانوں نے پیدا کیے ہیں۔ اور ہمارا جو دیہاتی کلچر ہے وہاں پرانی روایات ہیں۔ اس کو بھی سیاست دانوں نے...... وہ ایسے ہی موجود ہیں۔ تو میں نے اس کو پیش کیا ہے۔ آپ جا کے دیکھیے بارہ بنکی میں اور لکھنؤ میں۔
گوپی چند نارنگ : قرۃ العین حیدر کے یہاں آپ دیکھیں، تصوف کو اگر آپ اس طرح لیں کہ انسان کا اعتقاد کسی برتر قوت سے یا روحانیت کس طرح سے ہماری زندگی کے عام واقعات میں ...... کوئی نہ کوئی لمحہ ایسا آ جاتا ہے تصوف کے اثرات اور

ہمارے اندرونی ...Crisis کا کہ خود احساس ہونے لگتا ہے۔ اور یوں اگر بالکل آپ واقعہ کے طور پر یا Movement کے طور پر یا ہماری تاریخ کے حصے کے طور لیں تو وہ بھی ...... چونکہ اس سے پہلے اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر سے پہلے تاریخ نہیں تھی تہذیب نہیں تھا ...... اس طرح کا تاریخی شعور نہیں تھا۔

یہ پچاس برسوں کا زمانہ ہے۔ یہ تاریخ کا دباؤ اور تصوف...... آپ 'آگ کا دریا' دوبارہ دیکھیں۔ انتہائی خوبصورت، جہاں یہ تصوف کا یا ویدانیت کا، یعنی کس طرح انسان نے سوچنا شروع کیا اور کس طرح سے سارے خداؤں یا قادر مطلق، جو بھی ہستی کا مدعا ہے اس کے بارے میں انسان کس طرح سوچتا ہے...... اور تہذیبی تصادم نے کیا حسین خیالات پیدا کیے ہیں۔ اور پھر اسلام سے جب پیوندکاری ہوتی ہے تو تصوف کی صورت میں۔ کبیر والا حصہ پڑھیے، اور جب کمال سفر کرتا ہے اور وہ یعنی جب پُل کا ذکر آجاتا ہے بیچ بیچ میں، جب صوفیا کا ذکر آجاتا ہے، جب بھگتوں کا ذکر آجاتا ہے، کبیر کا ذکر آجاتا ہے، کمال کا ذکر آجاتا ہے وہ سب تصوف...... اس کا Interpretion ان کا بہت اچھا ہے۔ 'آخرِ شب کے ہم سفر' میں دیکھیے۔ اب دیپالی سے زیادہ فعال کردار کون ہوسکتا ہے انقلابی۔ کیا کیا وہ داؤں پر نہیں لگاتی ہے۔ جب اس پر وہ بات بھی آتی ہے جو اٹھائی گئی ہے، یعنی انسان کا Predicament ہے۔ چونکہ عورت کا وجود جذباتیت سے عبارت ہے تو وہ دعوت پر کسی طرح چلی جاتی ہے سندر بن۔ لیکن سندر بن سے جب لوٹتی ہے تو وہ والا چیپٹر پڑھیے۔ تو آپ کس درجہ المناک کیفیت سے گزریں گے ان کو پڑھتے ہوئے۔

آپ کرداروں کے ساتھ اور ناول کے آخر آخر تک پہنچتے ہوئے کہیں کہیں 'مایا' کا جو سایہ لہراتا ہے وہ جو بنگالی ذہن ہے خاص، اس میں شکتی کا تصور ہے۔ یہ سب تصوف سے ملتے جلتے خیالات ہیں۔ یعنی کیا کوئی روح ہے، کیا کوئی وجود بلند و بالا ہے، کیا کوئی طاقت ہے جس کے سامنے انسانی زندگی کے آدرش بے وقعت اور بے معنی

ہو جاتے ہیں۔ تو کرداروں کے بارے میں صرف یہ عرض کرنا چاہوں گا مختصر طور پر کہ ہم جب پڑھتے ہیں تو یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ان کرداروں کے ذریعے مصنف یا مصنفہ ہم سے بات کر رہی ہیں۔ ایسا ہوتا بھی ہے اور ایسا نہیں بھی ہوتا۔

مجھ پر الزام تو ہے کہ میں مغرب کی کچھ تھیوری کی بصیرتوں سے بھی کام لیتا ہوں اور مشرق کی بھی۔ میں آزاد خیال ہوں تصورات کی حد تک، اپنے مطالعے کی حد تک محنت کرتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ Text کو، فن کو یا ادب کو سمجھنے کی، جو بھی جہاں سے روشنی حاصل ہو اس کو اخذ کرنا چاہیے۔ مگر سینے کا نور بنانا چاہیے۔ میں سوچتا بہت ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ بولنے کے عمل کے ساتھ ساتھ بھی سوچتا ہوں۔ بہت سی کتابیں بہت سے مضامین میں نے صرف ڈکٹیٹ کرائے ہیں۔ دو گھنٹے میں، تین گھنٹے بیٹھ کے۔ کسی شاگرد کے ساتھ ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔ ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ میں ریکارڈ نہیں کر سکتا۔ پورے کا پورا پچاس ساٹھ صفحے کا مضمون۔ اس کے بعد نظر ثانی کرتا رہتا ہوں۔ دو دو مہینے تین تین مہینے۔ وہ اور معاملہ ہے۔ کبھی لکھنے سے پہلے دو دو برس پڑھتا ہوں۔

اب میں غالب پر بالکل نئے زاویے سے سوچ رہا ہوں۔ اس پر میں نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ شاید اس کو لکھنے کا عمل بیس برس سے...... یہ دو تھیوریز ہیں۔ کرداروں کے بارے میں ایک نکتہ ہے...... جس میں مصنف خود اپنے کرداروں کے ذریعے بات کرنے لگتا ہے۔ پریم چند پر یہ الزام کہ وہ بہت زیادہ Compromise کرتے ہیں۔ آئیڈیلزم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مصلحت پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خود ان کے جو قاعدے...... شروع میں ان پر جو...... چھاپ تھی یعنی بعد میں انھوں نے جو معاشرتی اثرات قبول کیے تو وہ مسائل مختلف ہیں۔ شروع میں وہ مسائل کو بہت جلدی جلدی حل کرنے لگتے ہیں اور ان کے کردار خود ان کی شخصیت کا عکس بن جاتے ہیں۔ ایسا فکشن گریٹ فکشن کے زمرے میں اکثر و بیشتر نہیں آتا۔ واقعتاً پریم چند کے

یہاں 'پوس کی رات' اور 'کفن' سے یہ بدلنا شروع ہوتا ہے۔ آخر میں 'گئودان' بلاشبہ ان کا بڑا شاہکار ہے لیکن افسوس کہ اس منزل پر پہنچ کر جلد اٹھ گئے۔

اب مغرب مشرق کو پہچان رہا ہے اور فکشن کے بارے میں...... اب مغرب میں فرانسیسی، انگریزی، جرمن میں میخائیل باختن روس کے انقلاب کے فوراً بعد لکھ رہا تھا۔ شروع میں جھوٹے ناموں سے لکھتا تھا۔ اب اس کی کتابیں محفوظ ہیں اور لوگ اس کو اب پڑھ رہے ہیں۔ اس کی ایک تھیوری ہے، وہ کہتا ہے کہ فکشن میں جہاں مصنف نہ صرف خود اپنی تجزیہ نگاری کرے بلکہ جن کرداروں سے اس کا ٹکراؤ ہے۔ اس کہانی کے ذریعے اس کا ہر کردار مختلف زبان بولتا ہے یعنی مصنف خود نہیں بولتا، اس کے Dialogic کردار بولتے ہیں۔

زبان میں مصنف خود اپنے کرداروں کو تراشنے میں بہت محتاط ہوتا ہے۔ کہانی کے ذریعے ہر کردار مختلف زبان بولتا ہے۔ کرداروں کا انفراد ان کی اپنی آواز ہے۔ ہر کردار اپنی زبان بولتا ہے اپنے مزاج کے مطابق ...... یہ جو سیتا ہرن کا Protagonist ہے۔ اس کا مقابلہ اگر ہاؤسنگ سوسائٹی کے جمشید سے آپ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عینی اپنے کرداروں کو تراشتے وقت کتنی محتاط ہیں...... ان کا ہر کردار، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو ہو یا دلربا، آپ کو معلوم ہوگا کہ سب اپنی اپنی Cricis کا شکار ہیں، اپنی کمزوری کے ذریعے اپنی کمزوریوں، اپنی طاقت کو پیش کررہے ہیں، اپنے نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کلاسیکی روش کو پیش کرنے کے لیے ان کرداروں کو نہیں تراشا۔ کرداروں کا Cricis ان کی اپنی آواز میں ہے۔ اس طرح قرۃ العین حیدر کا فکشن انسانی کرداروں کا نگارخانہ بن جاتا ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں زندگی کی سچی تصویر پیش کررہا ہے۔

کرداروں کا Crisis تو ان کی اپنی آواز ہے اپنی کلاس کی پہچان کے لیے بھی۔ چمپا اور سیتا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عورت کا مقدس کردار بدلتا ہی نہیں...... اور

وقت سے نبرد آزمائی۔ ان کا فکشن جو ہے انسانی کرداروں کا نگارخانہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں انسانوں کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے۔ میں اُس طرف جانا چاہوں گا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فکشن زندگی کی سچی تصویر پیش نہیں کرتا۔ یعنی وہ Fact نہیں۔

اب میں اس مسئلے کی طرف جانا چاہوں گا کہ ہم اسے فکشن کیوں کہتے ہیں، Fact کیوں نہیں کہتے۔ تاریخ اور فکشن میں کیا فرق ہے۔ مجھ کو تاریخ پڑھنا ہو تو میں مجمدار کو پڑھوں گا، مشہور نامور Historians کو پڑھوں گا۔ غالب کے زمانے کی تاریخ پڑھنا ہو، غالب کے زمانے کے انسانی دُکھ درد پڑھنا ہوں تو میں غالب کے خطوط پڑھوں گا۔

آج کے زمانے میں نصف بیسویں صدی کی جو انسانی روح کا کرب ہے اُس پر کیا گزری، انسانی وجود پر کیا گزری، انسانی اقدار پر کیا گزری، انسانی تہذیب پر کیا گزری۔ یہ جو نگارخانہ ہے، وہ اُن کرداروں میں آپ کو ملے گا۔ اور کبھی فکشن کو سچ نہیں سمجھنا چاہیے اور پھر اُس کو بناتے وقت، تراشتے وقت ہر Creative act مصنف کے ذہن سے گزر کر کردار بنتا ہے۔ اگر اخبار کے یا تاریخ کے یا روزمرہ کے واقعات سے کردار، افسانہ یا ناول یا ڈرامہ بنائیں تو وہ بن نہیں سکتا کیونکہ وہ Mundane ہے روٹین ہیں۔ ٹالسٹائے کا مشہور War and Peace کیوں پڑھتے ہیں۔ شیکسپیئر کیوں پڑھتے ہیں۔ غالب کو کیوں پڑھتے ہیں۔ اس لیے کہ سب فکشن ہے۔ سب مجاز ہے۔ جب بھی قرۃ العین حیدر Narrate کر رہی تھیں چاہے اپنی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات کو...... وہ ان کے موضوع کی Creativity کے عمل سے فکشن بنتا ہے بلکہ ان کے تخلیقی ذہنی عمل سے فکشن بنتا ہے۔

بس فکشن کی خوبی یہ ہے کہ فکشن ایسا جھوٹ ہے جو سچ سے بھی زیادہ سچ ہے۔ تو کرداروں کو کبھی بالکل ان کے سو فیصد انسانی زندگی پر...... بلکہ یہ سوچیں کہ مصنفہ نے اس کردار کو تراشتے وقت کن اقدار کو، کن Crises کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور

کس طرح زندگی کے سچ کو، زندگی کے کچے سونے کو ایک نیا سونا بنا کر ڈھالا ہے۔ سچ کو جھوٹ سے گزار کر ایسا سچ بنایا ہے۔ زندگی کا سچ تو روز اخبار میں آتا ہے اور روز شام تک پرانا ہو جاتا ہے اور اگلے دن گم ہو جاتا ہے۔ لیکن ادب میں جو کچھ سچ جھوٹ کے عمل سے گزرتا ہے یعنی Narration کے تخلیقی، ذہنی عمل سے گزرتا ہے پھر سچ بنتا ہے، وہ صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔ بارود کی گولی سے بارود تو نکل جاتا ہے اور کارتوس گر جاتا ہے خالی، لیکن اس میں سے آگ نکلتی ہے۔ جب ہم بار بار پڑھتے ہیں۔ تخلیق میں ہر قرأت گولی کی طاقت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی کیونکہ قرأت کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ قاری کا عمل بھی تخلیقی تفاعل رکھتا ہے۔

غالب کے انتقال ہوئے دو ڈھائی صدی گزر چکی ہے لیکن غالب کا شعر زندہ ہے، باغ و بہار اور گئودان زندہ ہیں آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر زندہ ہیں۔ تو وہ کارنامے جن میں تخلیق وقت کی کلائی کو مروڑ دے، وقت کے محور پر زندہ رہتے ہیں۔ جو زندہ رہتے ہیں کارنامے، ان کارناموں میں زندہ رہنے کی جو صلاحیت ہے وہ سچا فکشن ہے۔ وہ سچ سے بھی بڑا سچ ہے۔

یاور عباس : ایک سوال میں پوچھنا چاہتا ہوں یہ تو ہوئیں گہری باتیں۔ اب عینی تمہارے لکھنے کا طریقہ کیا ہے۔ نارنگ تو سوچتے جاتے ہیں اور لکھتے جاتے ہیں۔ تمھاری روٹین کیا ہے دن کے وقت لکھتی ہو یا رات کو۔ کچھ خاص نوٹس بناتی ہو۔ اتنی مستند تفصیلات ہیں تمہاری کتابوں میں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ تم نوٹس بھی بناتی ہوں گی۔

قرۃ العین حیدر : پہلی بات تو یہ ہے کہ بہت لوگ یقین نہیں کریں گے کہ میں اپنے آپ کو باقاعدہ رائٹر نہیں سمجھتی۔ میں اپنے بارے میں کبھی بات نہیں کرتی...... جیسے ہم عجیب لوگ ہیں۔ میں عجیب ہوں۔ میں اور میرا فن وغیرہ۔ میں نے ایسا کبھی کیا ہی نہیں، نہ میں کبھی کرتی تھی۔ نہ کبھی سوچا کہ میں کس طرح لکھتی ہوں۔ تو یہ کہ بس لکھتی

ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اپنے بارے میں لکھنا بہت Pompous بات ہے۔ بقول عصمت آپا، ہاں دل چاہتا ہے لکھتے ہیں۔ آپ سے مطلب؟ آپ کون ہیں پوچھنے والے۔ (ہنسی) واقعہ یہ ہے کہ بتانا مشکل ہے۔ انسان کس بارے میں سوچتا ہے۔ کوئی چیز تنگ کرتی ہے، کوئی واقعہ تاریخ سے متعلق ہو یا کچھ ایسا ہو تو وہ میں ذہن میں رکھ لیتی ہوں، نوٹ کر لیتی ہوں۔ لیکن عام طور پہ تو میں لکھتی ہوں دماغ میں جو آتا ہے لکھتی ہوں۔

یاور عباس : شب بیداری کرتی ہو یا دن کے وقت لکھتی ہو۔

قرۃ العین حیدر : نہیں نہیں۔ شب بیداری تو نہیں کرتی ہوں۔ مجھے رات میں پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ میرے بڑے Handicap ہو گئے ہیں۔ میری آنکھیں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ تو میں رات کو نہیں لکھتی ہوں۔ تو بہرحال پڑھنے لکھنے کا وقت بہت ہی محدود ہو گیا ہے۔ بول کر لکھوانے میں اور خود لکھنے میں بہت فرق ہے۔ لکھنے میں آپ کا اس کاغذ اور قلم سے کچھ رابطہ ہو جاتا ہے ذاتی۔ اب آپ بول رہے ہیں تو ریکارڈر کے ساتھ تو وہ بات نہیں ہو سکتی ہے۔

گوپی چند نارنگ : جب آپ کی نظر ٹھیک تھی تب بھی آپ رات میں جاگ کر کام کرتی تھیں یا جب بھی وقت مل جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر : کبھی کبھی۔ بھئی میرے ساتھ یوں ہے کہ میرے لکھنے کا کبھی کوئی وقت مقرر نہیں ہے کہ خاص طور پر بیٹھ کر لکھوں۔ میں نے کبھی ٹام ٹام نہیں کیا کہ اس وقت سے اس وقت تک لکھوں گی، اس وقت باغ میں ٹہلوں گی، مطالعہ کروں گی آسمان کے رنگ کا۔ جب موڈ آیا وہیں اسی وقت بیٹھ کر لکھ لیا۔ کہیں پر بھی بیٹھ کر لکھ لیا۔ ایک بار میری والدہ بمبئی ہاسپٹل میں تھیں۔ تو وہ اندر کمرے میں ہوتی تھیں۔ تو میں نے باہر بیٹھ کر 'آخرِ شب کے ہم سفر' کے کئی چیپٹر لکھے وہاں بیٹھ کر ہسپتال میں۔ کئی بار کہیں پر وقت ملا لکھ دیا جب بھی میرے ذہن میں آیا۔ اس کے لیے مجھے دن رات

کی کوئی قید ہے نہ ٹائم مقرر ہے۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ کوئی خاص بات نہیں۔
سوال : شاعری تو آمد کی بات ہے نا۔ آمد ہے تو روک نہیں سکتی ہیں آپ۔
قرۃ العین حیدر : آمد کی بات یہ ہے کہ کوئی بات اثر کرتی ہے، آواگون ہوتا ہے۔ آمد سبھی کو ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو ریکارڈر سمجھتی ہوں۔ ریکارڈ کرتی ہوں حالات کو۔ ارے بھئی ہو جاتا ہے کچھ نہ کچھ۔ لکھنے کے بارے میں بات کرنا بہت مشکل لگتا ہے۔
شاہدہ اُسید : ابھی گفتگو کے دوران بڑے بڑے ادیبوں کا نام لیا گیا۔ بیدی، عصمت چغتائی، منٹو وغیرہ۔ ان کی کتابیں محدود زمانے پر مبنی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے لیے اسی زمانے میں جانا پڑتا ہے۔ آپ کی کتابیں ہر زمانے میں پڑھی جا سکتی ہیں، ہر وقت بھی پڑھی جا سکتی ہیں، لیکن اُن ادیبوں کی کتابیں پڑھنے کے لیے اُسی زمانے میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔
قرۃ العین حیدر : اُن کی دُنیا الگ تھی۔ اُن کا ماحول الگ تھا......کبھی میں نے سوچا نہیں اُس بارے میں۔ میں نے اپنے بارے میں، اپنی اہمیت کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔
ایک خاتون : آپ کو خیالات آتے ہوں گے آپ ان کا تجزیہ کرتی ہوں گی۔
قرۃ العین حیدر : ارے بھئی ہو جاتا ہے کچھ نہ کچھ۔ فکشن کے بارے میں بات کرنا بہت مشکل ہے۔
سیّد حسن : اچھا یہ بتایئے 'آگ کا دریا' آپ نے کتنے عرصے میں لکھا؟
قرۃ العین حیدر : ایک سال۔
ایک صاحب : اچھا میں آپ سے 'چاندنی بیگم' کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ چاندنی بیگم اس ناول کا مرکزی کردار ہے تو پڑھنے والوں کو یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ چاندنی بیگم ناول کے شروع میں مر جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر : دیکھیے بعض ناول ایسے ہوتے ہیں جن میں Main کردار کبھی آتا ہی نہیں۔ ایک ناول تھا...Rebecca ربیکا جو ناول کی عورت کردار ہے وہ کبھی آتی ہی نہیں۔ ربیکا جو ہیروئین ہے وہ زندہ نہیں۔ وہ کبھی آئی ہی نہیں۔ ناول کو آپ ایک بندھا ٹکا فارمولا کیوں سمجھتے ہیں کہ ہیروئین جو ہے وہ شروع سے آخر تک زندہ رہے یا مر جائے۔ یہ پرانے فارمولے ہیں ناول نگاری میں۔ بقول عصمت آپا، مرنے کا دل چاہا مر گئے۔

یاور عباس : لیکن چاندنی بیگم کا کردار تو......

قرۃ العین حیدر : That's the whole point، چاندنی بیگم ایک سمبل ہو جاتی ہیں۔ المیہ ہے ایک تہذیب کا۔ عورت کی ٹریجڈی کی علامت بن جاتی ہے۔ وہ تو سمجھنے کی بات ہے۔ اگر آپ Literary کہیں کہ چاندنی بیگم تو ناول کا نام ہے لیکن وہ تو شروع ہی میں ختم ہو گئیں۔

سیّد حسن : اپنی تحریروں میں آپ کو کون سا ناول یا ناولٹ سب سے زیادہ پسند ہے۔

قرۃ العین حیدر: مشکل ہے کہنا صاحب۔ بعض بعض پسند ہیں۔ چاندنی بیگم مجھے پسند ہے۔

سوال : آپ کے ناولوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جو وقت گزر چکا ہے اس میں بہت خوبیاں تھیں۔ اب جو وقت گزر رہا ہے اس میں حالات بدتر ہو رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر : میرے خیال میں اکثر لوگوں کو یہی احساس ہوتا ہے۔ عام طور پر سبھی کو ہوتا ہے۔ اس بارے میں افسوس بھی ہوتا ہے کچھ۔

سوال : جو واقعہ ہوا ہے اسے فوراً لکھیں گی؟

قرۃ العین حیدر : تھوڑا وقفہ چاہیے لکھنے کے لیے۔ فوراً لکھیں تو وہ رپورٹ بن جائے گی۔ جب آپ کچھ عرصے بعد لکھیں تو اس میں افسانہ پن پیدا ہو جائے گا۔ یہ

سب منحصر کرتا ہے......

محبوب نقوی : غالب کے متعلق، غالب کے بارے میں گوپی چند نارنگ نے لندن یونیورسٹی میں جو لیکچر دیا تھا جو بات آپ کہہ رہے تھے Negative dialectics اس کے بارے میں عینی آپا پوچھ رہی تھیں۔

گوپی چند نارنگ : میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ غالب کی حیثیت اب World Class شاعر کی ہے۔ غالب دلّی یا اردو کا شاعر ہی نہیں، اب غالب کا نام شیکسپیئر اور گوئٹے کے ساتھ لے سکتے ہیں۔ اب غالب کی جو Awareness ہے اس میں میرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں نسخۂ اول کی جب دریافت ہوئی 1916 میں اور 1921 میں وہ چھپا اور 'محاسن کلام غالب' میں بجنوری کا پہلا جملہ ہے ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب''۔ تو میرے لیے بھی دیوان غالب مقدس ہے۔ یہ جملہ بہت دہرایا جاتا ہے۔ اس پر نہ کسی نے سوچا نہ عبدالرحمٰن بجنوری نے اس بات کی وضاحت کی کہ وہ غالب کو وید مقدس سے کیوں بریکٹ کررہے ہیں۔ یہ بات اُن کی پیشن گوئی...... خود غالب بھی بار بار پیشن گوئی کرتے ہیں کہ:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصّور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

یعنی ایسے گلشن کا بلبل ہوں جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے اور یہ حقیقت ہے وہ گلشن صدی کی ہر کروٹ کے ساتھ پیدا ہورہا ہے اور غالب کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ لیکن غالب کا 19 سال والا اور 24 سال والا منسوخ نسخہ دریافت ہوچکا ہے۔ 19 سال والا خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا بعد میں دریافت ہوا۔ وہ عجیب خزانہ ہے غالب کے تخلیقی ذہن کو سمجھنے کا۔

ایک تو میں سمجھتا ہوں یہ بالکل ایک Myth ہے۔ غالب نے اپنے دیوان کا

انتخاب کسی کے مشورے سے نہیں کیا۔ نہ فضل حق خیرآبادی یا کسی دوسرے نے کیا۔ میرا خیال ہے کہ غالب نے اپنے دیوان کا انتخاب کسی کے مشورے سے نہیں کیا۔ جو آدمی اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا، اپنے معاصرین کو نہیں مانتا، سوائے بیدل یا مغل شعرائے ماضی کے یعنی عرفی، ظہوری، نظیری کے کسی کا ذکر نہیں کرتا، سوائے میر کے کسی کو نہیں مانتا، مومن کے ایک شعر پر کہنا کہ اگر مومن اپنا یہ شعر دے دے تو میں اپنا پورا دیوان دینے کو تیار ہوں۔ میرا خیال ہے یہ تبسم زیر لب کے ساتھ کہا گیا ہے۔ سچ کے لیے نہیں۔ وہی غالب ...... ایک تہائی کلام اپنا منسوخ کر کے، جواب دریافت ہو گیا۔ دریافت نہ ہوتا تو گم ہو چکا ہوتا۔ وہ کلام ایسا ہے کہ بیسویں صدی میں بجنوری کے مقدمے کے بعد جتنی غالب شناسی کی منزلیں ہماری تنقید نے طے کی ہیں ان میں نسخۂ حمیدیہ کے اشعار پر زیادہ تر بحث کی گئی ہے۔ ایسے بہترین اشعار نسخۂ منسوخ میں ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یا

جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

یعنی جس شخص نے اپنے دو ہزار اشعار نکال کر الگ کر دیے۔ کالیداس گپتا رضا نے اب دیوان کامل کو چھاپ دیا ہے...... یہ بہت بڑا مسئلہ ہے شعریات کا کہ شاعری یا کوئی بھی فن پارہ، قلم بند کر دیا جائے تو اشاعت کے بعد اس پر مصنف کا، لکھنے والے کا بس نہیں ہوتا۔ آج کی تھیوری یہ کہتی ہے۔ اور غالب کا کلام اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ فن پارہ جو ایک بار لکھ دیا جائے تو وہ پبلک Domain میں چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی جتنی تفہیمات ہیں، جتنی تعبیرات ہیں وہ قرأت کا تفاعل ہیں۔

"Meaning is in flux. Meanig is infinite because the context is

"infinite" ۔ضروری نہیں کہ ہر معنی مصنف یا مصنفہ خود قائم کرے۔ غالب نے اپنے بہت سے اشعار کے معنی اپنے خطوط میں اپنے شاگردوں کو لکھ کر بھیجے ہیں۔لیکن اس سے بہت مختلف معنی غالب کے شعروں کے بعد کے مشاہرین نے بیان کیے ہیں۔ ہر شرح مختلف ہے۔ کیوں؟

غالب کے اشعار کیا حاکم پارٹی، کیا حزب مخالف، کیا رائٹ، کیا لیفٹ، ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ہر کوئی غالب کو Quote کرتا ہے اور اپنا مسئلہ پیش کرتا ہے۔ حالی نے الگ معنی لیے، بجنوری نے اور معنی لیے۔ مجھ سے پوچھا گیا شرحوں کے بارے میں۔ میں نے کہا جتنی شرحیں غالب کی لکھی گئی ہیں کسی اور کی نہیں لکھی گئیں۔ کم از کم بیس پچیس شرحیں جید لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ ہر کسی نے الگ الگ شرح پیش کی ہے۔ ایک کی شرح دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیوں؟ یہ ایک معمے سے کم نہیں۔ کسی اور موقع پر عرض کروں گا۔

مجھے متعدد نکتے سوجھتے ہیں۔ زلزلہ سا آتا ہے۔ غالب کی جڑوں کو کھوجنا آسان نہیں۔ بیدل ان کے استاد معنوی سہی۔ لیکن زمانے کا فرق ہے وہی جو اورنگ زیب اور بہادر شاہ ظفر میں ہے۔ یہ وید مقدس کہاں سے آ گیا یا خود غالب کا دعویٰ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالب کے یہاں Negative dialectics کا عمل ہے، اور ہر چیز کو غالب Subvert کرتے ہیں، معمولی اشعار کو بھی:

درد منّت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

بھئی کیوں؟ آپ دوا لیتے تو اچھا تھا۔ علاج کارگر ہو جاتا تو اچھا تھا۔ دوا اسی لیے لی جاتی ہے۔ غالب دعویٰ کرتے ہیں اور پھر دلیل لاتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں

تمثیل نگاری کی جو روایت تھی اُس کے بالکل اُلٹ:

ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اب دیکھیے یہ تو ہو گیا ثبوت۔ دعویٰ کیا ہے؟ دعویٰ ہے 'درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا'۔ بھئی آدمی حد سے گزر جائے گا تو مر جائے گا۔ بہت سی ایسی باتیں جب غالب نے کرنا شروع کیں...... اور ایک انوکھی Dialectics لاجک۔ غالب کی انوکھی لاجک ہے...... تو لوگوں نے کہا غالب جھک مارتا ہے۔

کلامِ میر سمجھے یا زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھے یا خدا سمجھے

اور غالب جواب میں کہتے ہیں:

ع گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل

مزید یہ کہ:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

---

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

لیکن جو خون میں داخل ہے، جو تحت الشعور میں ہے وہ راہ نہیں چھوٹتی۔

ایک مصرع ہے:

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے

یعنی نگاہ جو ہے وہ خبر کو نہ مانے، ایک Negative۔ خبر جو ہے وہ چشم کو نہ مانے، عدو جانے، دو Negative،

وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

......معنی کھل گئے...... اور

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یا

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ان کی Poetic logic یہ ہے کہ جتنے Phenominal words ہیں عالم موجودات میں اس کو عام لاجک سے آپ سمجھ نہیں سکتے۔ میں اس کی پراسرار تخلیقیت کی جڑوں کی کھوج میں ہوں۔ کچھ سراغ ہیں لیکن آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ میرا تفہیمی کھوج کا سفر جاری ہے۔ سب پراسرار سوال ہی سوال ہیں۔

عینی کے بارے میں آخری بات: ایک معنوں میں قرۃ العین حیدر کا پورا فکشن یہ بات کہتا ہے کہ مقدر جو انسان کی Destiny ہے اُس کو آپ عام Common sense category سے نہیں سمجھ سکتے۔ یا تو آپ Positive side لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا Negative side لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ Plato کے فلسفے کو چھوڑیئے۔ غالب کا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔ غالب بدھسٹوں کی طرح، کنفیوشس کی طرح یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی جو Phenominal categories ہیں ان کو آپ Real or unreal terms میں نہیں لے سکتے، یعنی دو اور دو چار والی لاجک نہیں۔

غالب کی Thinking بہت پراسرار ہے۔ Determinate اور Indeter-minate کے بیچ کی جو دراڑ ہے، حقیقت اور غیر حقیقت یا ہستی اور عدم ہستی کی ...... اور کہیں نہ کہیں غالب کی پوری کی پوری شاعری اور جہانِ معنی اس درز میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ تہوں کو کھول دیتی ہے اور معنی کو Indeterminate کر دیتی ہے۔ اس وجہ سے میرا خیال ہے...... میں غلط بھی ہو سکتا ہوں کہ یہ سو برس کا عمل نہیں بلکہ Archetypal ہے۔ پونے دو سو برس کے عمل میں نوجوانی کے چوبیس برس تک کا

بہترین کلام ہے۔ ایک صدی سے غالب کی تہیں کھولی جا رہی ہیں۔ کہیں پر کوئی Closure نہیں۔ اگر Closure ہے تو غالب شناسی کے ماہرین بتائیں کہ Closure کہاں ہے۔ کسی بھی بڑی شاعری میں Closure نہیں ہوتا۔ ہر آرٹسٹ کے اپنے طورطریقے ہوتے ہیں، اپنا اسٹائیل، اپنا تخلیقی رمز ہوتا ہے۔ تخلیق ایک Mystery ہے۔ تو تخلیق کی ساری خوبیوں کو کوئی تنقید نہیں کھول سکتی۔ تنقید ہمیشہ Proximate تفہیم و تحسین کرتی ہے۔ قرأت کی کوشش کرتی ہے۔ پڑھ کر تفہیم کی کوشش کرتی ہے۔ تفہیم کر کے تحسین کی کوشش کرتی ہے۔ اُس کی لذت، اُس کی جمالیات و شعریات میں ہے۔ غالب شناسی میں بہت منزلیں اردو کے بہترین ذہنوں نے طے کی ہیں۔ لیکن یہ کہ غالب کو پوری طرح سمجھ لیا گیا ہو اور سارے سوالوں کا جواب دے دیا گیا ہو، آج تک ایسا نہیں ہوا ہے۔ تو میں کچھ اور سوالوں میں داخل ہونے کی طالب علمانہ کوشش کر رہا ہوں۔

یاور عباس : یہ ہماری اور آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی دو جید اور مقتدر ہستیاں یہاں موجود ہیں۔ آپ لوگوں کو احساس نہیں ہوتا کہ کیسے کیسے لوگ ہمارے پاس ہیں اور وہ ہم سے محبت سے ملتے ہیں اور بلا تکلّف ملتے ہیں۔ اس شام کو آپ یاد رکھیے گا اور سوچئے کہ کیسی کیسی ہستیاں ہمارے پاس تشریف لائی ہیں۔

سیّد حسن : خواتین و حضرات جیسا کہ یاور عباس نے کہا ہم اس شام کو یاد رکھیں گے اور جیسا کہ گوپی چند نارنگ نے کہا کہ واقعی ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اُردو ادب کی بہت ممتاز ہستیاں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اگر ہم سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معافی چاہتے ہیں۔ عینی آپا کا بہت شکرگزار ہوں کہ وہ یہاں تشریف لائیں۔ یاور عباس صاحب کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے کارروائی چلائی۔ میں گوپی چند نارنگ صاحب کا شکرگزار اور احسان مند ہوں کہ وہ میری دعوت پر یہاں تشریف لائے۔ میں مجاہد تنویر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ نہ صرف وہ آئے بلکہ اپنے

ساتھ گوپی چند نارنگ صاحب کو بھی لے آئے۔ میں سارے مہمانوں اور میزبان کا بہت بہت شکرگزار ہوں۔

اس دلچسپ ادبی گفتگو کا سلسلہ اختتام کو پہنچتا ہے لیکن مزید سننے کی خواہش سب کو ہے۔

ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

○

# چند یادگار تصویریں

(بائیں سے) پروفیسر گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر، یاور عباس، شاہدہ اُسید رضوی، حمیدہ (مرحوم) (مسز یاور عباس)

(دائیں سے) مہر نقوی مہمانوں کے ساتھ

# چند یادگار تصویریں

(بائیں سے) سید حسن (مرحوم)، پروفیسر گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر، مجبوب نقوی (مرحوم) فلور پر بیٹھے ہوئے

سید حسن (مرحوم)، [illegible]، پروفیسر گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر اور حمیدہ حسین

# قرۃ العین حیدر مشاہیر کی نظر میں

— رحمان عباس

**یاور عباس**

میں ان کے فن کے ایک ایسے پہلو پر اختصار کے ساتھ دو چار جملے کہنا چاہتا ہوں جسے عموماً نظرانداز کردیا جاتا ہے یا پھر انھیں کی سویٹ (Sweet) زبان میں ٹیک فار گرانٹڈ (Take for Granted) کہا جاتا ہے اور وہ ہے واقعہ نگاری یا رپورتاژ کا فن۔ اُردو میں روزنامچے ہیں، بے شمار سفرنامے ہیں، لیکن روزنامچوں اور سفرناموں کو چھوڑ کر وقائع نگاری جیسے کہا جائے وہ اُردو میں بہت کم ہے اور جو ہے اس میں زیبِ داستان اتنی ملی ہوئی ہے کہ اسے وقائع نگار کہنا درست نہ ہوگا۔ قرۃ العین حیدر نے 'کارِ جہاں دراز ہے' کی دو ضخیم جلدیں لکھ کر وقائع نگاری یا رپورتاژ کو ایک معتبر صنف کا درجہ دے دیا۔

قرۃ العین حیدر نے ان کتابوں کو ایک 'سوانحی ناول' کہا ہے۔ یہ ان کا اپنا ذیلی عنوان ہے۔ ہم اس سے اختلاف کرنے والے کون؟ لیکن اس کے تمام کرداروں، اس کا پلاٹ، اس کا محل وقوع، اس کے مکان، اس کے مکین، اس کے گاؤں، اس کے شہر، اس کی ندیاں، اس کے پہاڑ، اس کی وادیاں، اس کے جنگل سب سچ مچ کے ہیں، جو زبانِ حال سے نہیں بلکہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ حقیقت افسانے سے عجیب تر ہے۔ پھر قرۃ العین حیدر جس طرح حقیقت بیان کرتی ہیں، وہ خود اپنی دلکشی میں افسانے یا ناول سے کسی طرح کم نہیں۔ (آجکل، دہلی)

**وارث علوی**

قرۃ العین حیدر ایک عرصے تک اردو میں بہ حیثیت افسانہ نگار مقبول رہیں، ان کے افسانوں میں ہمیں پہلی بار تلازمۂ خیال کی تکنیک کا استعمال ملتا ہے لیکن یہ تکنیک اور وہ منفرد اسلوب جو قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے ساتھ مخصوص ہے ماحول اور فضا کا طائرانہ نظر سے جائزہ لینے میں مدد دے سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے مطالعے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر صناعانہ چابکدستی، فنی مہارت اور تکنیکی صلاحیت کے اظہار کا بہترین ذریعہ مختصر افسانہ ہی ہے اور ان کا اسلوب اور تلازمِ خیال کی تکنیک اس سے زیادہ وسیع میدان میں شاید اتنی کامیاب نہ رہے، لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ قرۃ العین کے ناول ان کے افسانوں سے بھی زیادہ کامیاب ہیں اور آج وہ اردو کے ممتاز ناول نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ (سفینۂ غمِ دل)

**شمیم حنفی**

قرۃ العین کی حسیت اپنی شناخت اور تعبیر کے لیے ایک ساتھ کئی جہتوں اور سطحوں پر اپنے تجزیے کا تقاضا کرتی ہے۔ مذہب، فلسفہ، تاریخ، مافوق التاریخ، حقیقت پسندی، ماورائے حقیقت پسندی، اساطیر، رسوم، روایات، معاشرت، نفسیات اور سماجیات، غرض کہ جب تک بیک وقت متعدد زاویوں سے اس حسیت کا جائزہ نہ لیا جائے، اس کا کوئی نہ کوئی گوشہ نگاہ سے اوجھل رہے گا۔ اس حسیت کی گرفت میں آنے والے تجربے ایک نہایت شخصی اور وجودی سطح پر روشن ہوتے ہوئے بھی اجتماعی اور غیر شخصی واردات کی نفی نہیں کرتے۔ لہٰذا بیسویں صدی کے بعض مقبول عام فلسفوں کو بھی قرۃ العین حیدر کی حسیت تک رسائی کا واحد وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا، چہ جائے کہ کسی ایسے نظریاتی ضابطے کو جس کی حدیں صرف ایک قوم، ایک تہذیب یا ایک علاقائی وحدت کی پابند ہوں۔ ایسی صورت حال میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قرۃ لعین حیدر کے فکشن نے اردو میں شاید سب

سے پہلے قومی اور بین الاقوامی کی درمیانی لکیر کو تخلیقی اعتبار سے ہی نہیں، فکری اعتبار سے بھی مسترد کیا ہے۔ قرۃ العین کی حسیت جس نکتے سے اپنی تلاش کا آغاز کرتی ہے، اس نکتے کے تعین کے بعد بھی یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ اس نکتے کے فکری اور جذباتی مناسبات کسی بندھے ٹکے اجتماعی تجربے یا کسی ایک معاشرت، واردات کے تابع ہیں۔ مارکیز نے کہا تھا کہ ہمارا ایک بلیغ جملہ ایک ہزار برس کی ادبی روایات کے بخشے ہوئے شعور کا ترجمان ہوسکتا ہے، قرۃ العین کی حسیت کا پس منظر بے شک بہت وسیع ہے، لیکن اس پس منظر کی تاریخ اور جغرافیہ کا مفہوم محض ایک نظریے، ایک علاقے، یا ایک معاشرتی ماحول، یا ایک عقیدے کو اپنا حوالہ نہیں بناتا۔ (گردش رنگ چمن)

**شمس الرحمٰن فاروقی**

قرۃ العین حیدر نے اپنی زندگی کے آغاز کی تحریروں میں اور بالخصوص 'آگ کا دریا' میں ہندستانی تہذیب اور تاریخ کا ایک غیر معمولی اور آفاقی احساس پیش کیا تھا اور تاریخ اور تہذیب کے باہمی عمل اور ردِعمل کے تسلسل اور انقطاع کا جو شعور انھوں نے 'آگ کا دریا' میں پیش کیا اس کی مثال صرف اردو ہی نہیں بلکہ تمام ہندستانی فکشن میں نہیں مل سکتی۔ قرۃ العین حیدر کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ماضی قریب اور کبھی کبھی ماضی بعید کو بھی اپنی تحریروں میں پوری طرح زندہ کر دیتی تھیں بعض اوقات تو پڑھنے والے کو گمان گزرنے لگتا ہے کہ افسانہ نگار بھی اسی زمانے کا فرد ہے جس زمانے کی داستان وہ بیان کر رہا ہے۔ (قرۃ العین حیدر کی یاد میں، دریا بکنارِ دگر افتاد و گہر ماند)

**عتیق اللہ**

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے کینوس اتنے وسیع، ذہنی اور جذباتی تجربات کی دنیا اتنی رنگارنگ اور بیانیہ کے تفاعل اس قدر پیچیدہ اور تہہ دار ہیں کہ ہر ناول ایک نئی جستجو

کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ عینی کے یہاں ناول نے ایک ایسے چھتنار درخت کی صورت اختیار کر لی ہے جس کے سائے میں افسانے کے ننھے منے پیڑ پودوں کی طرف ہماری توجہ کم ہی منعطف ہوتی ہے۔ اپنے صحیح معنی میں عینی کے ناول کا فن Meta Narrative ہے جس کے عقب میں کہانی کا بیانیہ بہت کوتاہ معلوم ہوا ہے، معلوم ضرور ہوتا ہے لیکن اصلاً وہ اتنا کوتاہ بھی نہیں ہے۔

عینی کا ناول روایتی ناول نگاری کے فن پر ضربِ کاری تھا۔ وہ ناول مخالف بھی تھا، ناول شکن بھی، جس نے ہمارے رسمی قواعد و قوانین نیز مسلمات کو بڑی بے دردی کے ساتھ تہس نہس کیا تھا۔ عینی نے ناول کے فن کے تعلق سے ترجیحات کا جو نقشہ مرتب کیا تھا، اس میں الٹ پھیر کی خاصی گنجائش تھی۔ ناول کی وسیع بساط میں آزادی کے ساتھ کھیل کھیلنے کے مواقع نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں، جن سے عینی نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے برعکس افسانہ، ایک مختصر کاری فن ہے جس کے حدود اور تقاضوں کے تناظر Perspective ہی مختلف ہیں۔ باوجود اس کے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ عینی کے یہاں ناول میں جو کچھ سمونے سے رہ جاتا ہے افسانے کے قالب میں اسے جگہ مل جاتی ہے۔ بعض افسانوں کو چھوڑ کر عینی کے اکثر افسانے ان کے ناولوں کی کترنیں معلوم ہوتے ہیں، جنھیں وہ تھوڑی سی ذہانت، تھوڑی سی فنی چالاکی سے کام لے کر اپنے کسی نہ کسی ناول میں ٹانک سکتی تھیں۔ یوں بھی مختلف یادوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں اور پارچوں کو باریک دھاگوں میں پرو کر آمیلا تاز بنانے میں انھیں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ (قرۃ العین کے افسانوں میں تحیر خیزیاں)

**قمر رئیس**

قرۃ العین حیدر ایک بلند قامت اور بڑی تخلیق کار ہیں...... ان کی حقیقت شعاری ہر تخلیق میں زندگی کو کچھ نئے زاویوں سے دیکھتی ہے۔ اور کچھ نئی جہتیں دریافت کرتی

ہے۔ وہ اپنی تخلیقی ذہانت سے ناول کی اندرونی ساخت کو شگفتہ، خوش آہنگ اور فکر انگیز بناتی ہیں۔ اظہار و بیان پر قدرت کے سہارے وہ ایسے جان دار مرقعے بناتی ہیں، جن کی دلکش فضا قاری کو بہا لے جاتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو تخیلی نزاکت اور مصورانہ چابک دستی سے تراشتی اور سنوارتی ہیں۔ (قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ)

**نظام صدیقی**

قرۃ العین حیدر فی زمانہ ہند و پاک میں اردو ناولاتی ادب کی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے سب سے قدر آور تخلیقیت آفریں اور تخلیقیت گزار شخصیت ہیں۔ وہ اپنے قطعی طور سب سے الگ تھلگ مزاج کے تخلیقیت کیش ناولوں کے لیے پہنچانی جاتی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے تخلیقی ارتقا کی کلیت اور تخلیقیت کا گہرا فلسفیانہ وجودی احساس اور تواریخی عرفان ملتا ہے جو ہمیشہ ہر سطح پر 'نئے عناصر' کو منکشف کرتا ہے۔ وہ ان نئے عناصر کی تخلیقی قلب ماہیت پوری انسانیت کے تواریخی اور تہذیبی میراث کے پس منظر میں کرتی ہیں جس کے باعث ان کا تواریخی اور ثقافتی اسلوب بیشتر مابعدالتواریخ کا رنگ و آہنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی ذہنی وابستگی راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور عزیز احمد کے مانند کسی امریکی اور روسی بلاک کی زائیدہ نہیں بلکہ ساری انسانیت کی روح سے استوار ہے۔ ان کا تخلیقی وژن عالم گیر وسعت سے ہمکنار ہے۔ تصوف اور ہند ایرانی ثقافت اور روحانیت سے ان کو جذباتی لگاؤ ہے۔ دو عظیم جنگوں کے بعد ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے زائیدہ اپنے نئے سیاق کے اصولِ حقیقت Reality Principle کے تحت پیدا اضطراب انگیز مسائل کو انھوں نے اپنے ناولوں کا محور بنایا ہے اور اُس منفرد تخلیقی رویے اور برتاؤ کی تشکیل کی جو خارجی سچائیوں کے اثبات کے بجائے داخلی سچائیوں کی کھوج کا منبع ہے۔ (اُردو ناول میں تخلیقیت کا رجحان)

## انتظار حسین

ادب میں مسئلہ کسی واقعہ کو جذباتی اثرانگیزی کے ساتھ بیان کر دینے کا نہیں ہوتا ہے، یہ کام تو صحافت اور خطابت بھی بڑی خوبی سے انجام دیتی ہے۔ ادب میں مسئلہ ایک تجربے کو اپنی تمام تہوں اور گہرائیوں سمیت گرفت میں لانے کا ہوتا ہے۔ تجربہ لکھنے والے کی گرفت سے کبھی اس وجہ سے نکل جاتا ہے کہ وہ اسے اپنی ذات کا حصہ نہیں بنا سکتا اور کبھی اس باعث گرفت سے نکل جاتا ہے کہ وہ تجربے سے اپنی ذات کو علیحدہ کر کے اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اردو میں فسادات کے بارے میں افسانے، نظمیں اور غزلیں لکھی گئیں ان کے ساتھ بالعموم یہ دونوں طرح کے حادثے گزرے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی کہانیوں اور ناولوں کا موضوع براہ راست فسادات نہیں بلکہ فسادات سے پیدا ہونے والی نقل مکانی کی ابتلا ہے، جسے پاکستان میں آنے والوں نے ہجرت جانا اور اپنے آپ کو مہاجر کہا اور ہندوستان پہنچنے والے شرنارتھی کہلائے۔ قرۃ العین نے اس تجربے کو اپنی مختلف کہانیوں اور ناول میں اس گروہ کے واسطے سے دیکھا اور بیان کیا جس کا وہ خود حصہ ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کا نقطۂ نظر اس تجربے کے بارے میں اپنے گروہ کے عمومی نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔ (سیتا ہرن: انتظار حسین)

## زاھدہ حنا

ان کے افسانوں اور ناولوں سے مجھ ایسے بہت سے لوگوں نے عظیم ہندوستان کی عظیم الشان تاریخ اور تہذیب کو سمجھا۔ بدھ مت، ہندو مت، جین مت اور پھر یہاں کی ہند ایرانی تہذیب اور اس کا گنگا جمنی حسن، ان کی نگاہوں سے دیکھا۔ تاریخ کی بدصورتیاں بہت بعد میں سمجھ میں آئیں۔ میں ان ہزاروں خوش بختوں میں سے ایک ہوں جنھوں نے دنیا کی اس بے مثال اور نادر روزگار تہذیب کی سیر ان کی انگلی تھام کر کی اور یوں ہزاروں برس پر پھیلی ہوئی وہ ہفت رنگ ثقافت اور تہذیب وجود کے اندر

اتر گئی۔ طاؤس کے رنگوں والی یہ وہ من موہنی تہذیب تھی جو ہر فاتح کو فتح کر لیتی تھی اور غالب آنے والے آخر کار مغلوب ہو جاتے تھے۔ (قرۃ العین حیدر: یادوں کے رنگ)

**سیّد محمد اشرف**

تاریخ اور سماج سے متعلق ان کی یادداشت بہت وسیع اور گہری تھی۔ ان کی تحریروں میں جو حوالے ملتے ہیں وہ ہزاروں سال کی تاریخ اور ماقبل تاریخ کے ادوار سے رشتہ رکھتے ہیں۔ مشرق کی دانشورانہ روایت کے اکتساب میں ان کو جو مقام ہے وہ اردو کے کسی ادیب وشاعر کو حاصل نہیں ہوا، عزیز احمد کو بھی نہیں۔

عینی آپا کا روحانی وجدان سینکڑوں برس کی قدیم ثقافت کا دفاع کرتا ہے۔ ان کے فکشن میں جس ثقافت کا ذکر اور اس پر اصرار ملتا ہے وہ پوری تاریخ سے کشید شدہ مکمل ثقافت ہے۔ ہم انھیں صرف 'ہندستانیت' میں محصور نہیں کر سکتے۔ وہ اس کرۂ ارض کی مکمل تاریخ کا استعمال گہری انسانی ہمدردی اور دنیا بھر کی عورتوں کی بے بسی کو کمال فن کے ساتھ پیش کرنے کی ادبی قوت، انھیں بلاشبہ عالمی ادب میں ایسا مقام دیتی ہے جس کے لیے انھیں کسی بوکر پرائز یا نوبل پرائز کی ضرورت نہیں تھی۔

عینی آپا کی تحریروں میں عورت کے اندر کی طاقت، بے بسی اور صبر وضبط کو اتنی قوت، شدت اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جن ادیبوں اور شاعروں نے عورت کے باطن کی اس قوت کا مشاہدہ اور مظاہرہ اس پیمانے پر کیا ہے، ان میں عینی آپا کا قد سب سے زیادہ دراز ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے اپنی دنیا سے ان کا گہرا اور بامعنی تعلق تھا اور اس تعلق کے نتیجے میں ان کی جو انفرادیت متشکل ہوئی تھی اسے وہ بہت عزیز رکھتی تھیں۔ اجتماعی تنظیم سازی کے اس پورے دور میں انھوں نے اپنی انفرادیت اور فرد کے وقار کو بالا رکھا۔ (کیا قافلہ جاتا ہے)

**ناصر عباس نیّر**

قرۃالعین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں ایک انوکھا، طلسمی تجربہ کیا۔ برصغیر کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو ایک ہی بدلتے نام کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا۔ گوتم نیلمبر، ابوالمنصور کمال الدین، چمپا مختلف زمانوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے نام یکساں مگر شخصیت اپنی اپنی ہے۔ گپتا عہد کا گوتم نیلمبر، یورپی عہد کے گوتم نیلمبر دت سے جدا شخصیت رکھتا ہے۔ نام کی یکسانیت اگر Being کی علامت ہے تو شخصیت کی خودمختاری Becoming کی۔ نام، مطلق وقت کی طرح ہے جو ماضی، حال اور مستقبل پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں گوتم نیلمبر، کمال، سرل ایشلے، چمپا بطور اسم معرفہ بہ یک وقت ماضی، حال اور مستقبل میں موجود ہیں؛ وہ ہم وقتیت Simultaneity کے تصور کے نمائندہ ہیں، اور اس کا تجربہ بھی کرتے ہیں اور وقت کے پیٹرن میں موجود ہیں، اس لیے ان میں کوئی بھی غیرحقیقی نہیں۔ (ہم وقتیت کا یہ تصور اضافیت کی خصوصی تھیوری سے لیا گیا ہے) یہاں وقت کی فناکاری کے ساتھ اس کی حیات بخشی کا تصور بھی ابھارا گیا ہے۔ یعنی وقت اگر آگ ہے تو دریا بھی ہے، آگ جلاتی اور دریا زندگی کو باقی رکھتا ہے۔ ناول کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہ یک وقت being اور Becoming کو پیش کیا گیا ہے، یعنی جوہر اور وجود کو، حقیقت اور فکشن یا Appearance کو، وقت اور تاریخ کو، مگر ان میں روایتی ثنویت نہیں ابھاری گئی۔ مغربی فکر میں عموماً جوہر، حقیقت اور وقت کو وجود، فکشن اور تاریخ پر فضلیت دی گئی ہے؛ نوآبادیاتی عہد میں ہمارے یہاں بھی یہ فکر پہنچی؛ اسی کے زیراثر اصلاحی ادب کی تحریک پروان چڑھی جو اخلاقی جوہر اور حقیقت کی جستجو میں موجود اور فکشن کی نفی کرتی تھی۔ قرۃالعین حیدر دونوں کو بہ یک وقت اہمیت کا حامل ٹھہراتی ہیں۔ ایک ہی نام کے کئی گوتم وقت کے پیٹرن میں موجود ہیں، مگر ان کا ہونا دھوکہ نہیں۔ نیز ہر ایک کی الگ

شخصیت ہے، جس کا اثبات وہ تاریخ میں ایک خاص کردار ادا کر کے کرتے ہیں۔ اپنی شخصیت، انفرادیت کے اثبات کے طور پر وہ وقت کے دوہرے کردار (نفا وبقا) کا داخلی تجربہ کرتے ہیں۔ وہ لمحۂ حال میں اپنے اندر ماضی کو 'زندہ' محسوس کرتے ہیں، اور اس کے ضمن میں ذمہ داری کو بھی۔ اسی بنا پر وہ ان سب راستوں کو مسدود کرتے ہیں جو تاریخ سے فرار کے راستے ہیں۔ وہ تاریخ کا وہ بوجھ بھی اٹھاتے ہیں جو ان کے شخصی کرم کا نتیجہ نہیں تھا؛ یوں وہ اپنی شخصی ذات کو لاشخصی، ثقافتی ذات میں ضم کرتے، یا اسے توسیع دینے کا تجربہ کرتے ہیں۔ ('آگ کا دریا' میں شخصی و لاشخصی ذات)

**رحمٰن عباس**

قرۃ العین حیدر نے ستر سے زیادہ افسانے لکھے ہیں جن میں کئی ایسے ہیں جو اردو قارئین کی یادداشت کا حصہ بن چکے ہیں لیکن ان کی تخلیقی فکر کا کینوس دراصل ان کے ناولوں میں کھلتا ہے۔ تقسیم نے لوگوں کو ہجرت کے کرب میں مبتلا کیا، اس کرب سے قرۃ العین گزری تھیں، اس ضمن میں انھوں نے کہا ہے کہ ''میں نے محبت، نفرت، مذہبی کٹر پن اور بے رحمی کے بارے میں بہت غور کیا۔ انسان کی انسان کی جانب بے رحمی انفرادی اور اجتماعی طور پر، اجتماعی بے رحمی کے ساتھ تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس سوال نے مجھے فلسفۂ تاریخ کی طرف کھینچا۔'' تاریخ میں، عہد گم گشتہ میں، وقت کے سیل رواں میں، وہ آدمی کے سچ کو تلاش کرنے کا ایک طویل سفر شروع کرتی ہیں۔ 'آگ کا دریا'، تاریخ کے آتش کدے سے آدمی، تہذیب اور سیل وقت کے تقفس کی طرح ابھرنے کی روداد ہے جو بیک وقت: آدمی، وقت، تاریخ، تہذیب اور عرفان و آگہی کی بدلتی ہوئی ہیئتوں کا شعور عطا کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا اعتراف ہے کہ 'آگ کا دریا' میں انھوں نے زمانے کو سمبل بنا کر تین ہزار سال پر پھیلی ہوئی اور الجھی ہوئی ہندستانی تاریخ سے ہندستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی

ہے۔ بلاشبہ، تاریخ کو ادبی پیرائے میں پیش کرنے کا یہ ایک منفرد تجربہ ہے۔ وہی آج قرۃ العین کا ادبی سرمایہ اور اردو فکشن کی عظمت کا سمبل بن چکا ہے۔ (قرۃ العین حیدر اور تنقید کا احتساب)

○

# Qurratulain Hyder :

## An Author Par Excellence

—Gopi Chand Narang

If anyone can be called a phenomenon in modern Urdu fiction, it is Qurratulain Hyder, the author of the famous Urdu novel, *Aag ka Darya* (The River of Fire), which, in the late fifties, rocked the literary circles in Pakistan, and consequent upon the publication of which the author had to migrate back to India. Later, this novel was selected by the National Book Trust for their prestigious *Aadaan Pradaan* series for translation into various Indian languages. Though the novel went through many printings in India, but since it was published outside India (1956) and thus could not be taken up for Akademi's award, it was her collection of short stories, *Patjhar ki Awaz* (The Voice of Autumn), first published from New Delhi in 1965, which won the Sahitya Akademi Award in 1967. Following this, her novel *Akhir-e-Shab ke Hamsafar*, (1973), won for her the Jnanpith Award.

Qurratulain Hyder was born in 1927 in Aligarh, into an enlightened family of writers. Her father Sajjad Haider Yaldram was a highly respected original writer in Urdu, as was her mother Nazr Sajjad Hyder. Qurratulain passed her high school at the age of thirteen, and her M. A. in English

from Lucknow University at the age of 19 in 1946. She migrated to Pakistan in 1947 with her parents but returned to India after the publication of her magnum opus, Aag ka Darya, as mentioned before, and was given Indian nationality again. For some time she worked for the Daily Telegraph, London, and also for the B.B.C., London. She had attended Arts Schools in Lucknow and London and learned a good deal about music and painting, and had a sound knowledge of English literature besides being well versed in Urdu and Persian literary traditions. While in Bombay she worked as the editor of Imprint, and also served on the editorial staff of the Illustrated Weekly of India for many years. She was a member of the Film Censor Board of India, and a distinguished Visiting Professor at the Jamia Millia Islamia and the Aligarh Muslim University, Aligarh.

A number of novels, novelettes and short story collections make up Qurratulain Hyder's ouevre. *Aag ka Darya* (The River of Fire), *Mere bhi Sanam-khane* (My Temples Too), *Safina-i-Gham-e-Dil* (The Boat of the Heart's Grief), *Roshni ka Safar* (The Journey of Light) short stories, 1981; *Kar-e-Jahan Daraz Hai* (The Task of the World is Endless Vol. I, 1977, and Vol.11, 1979, a biographical novel) and *Aakhir-e-Shab ke Hamsafar* (The Travellers unto the Night's End) 1978, *Roshni ki Raftar* (The Speed of Light) 1982, *Gardish-e-Rang Chaman* and *Chandani Begum* are novels. *Seeta Haran, Dilruba, Chaee Ke Bagh, Agle Janam Mohe Bitya Na Kijo*, are novelettes. *Sitaron se Aage* (Beyond the Stars), *Sheeshay ke Ghar* (Glass Houses) and *Patjhar ki Awaz* (The Voice of Autumn) are collections of short stories.

She had written a number of articles in various journals in India and Pakistan. She had been writing fairly extensively in English on literary topics and arts, and had translated some books from Russian into Urdu. She had also translated Portrait of a Lady (Henry James) and Murder in the Cathedral (T.S. Eliot) into Urdu. With Sardar Jafri, she had edited Ghalib: Poetry and Letters, and with Khushwant Singh, Stories From India.

Almost all of Qurratulain Hyder's fiction reflects her preoccupation with India's cultural past, the past-ness of the past, as well as its relation with the present. There is a sense of urgency about her work in that what the Indian people now have become is closely linked with what they have been, and a reflection upon their present identity has to take into account the formative processes that have shaped this cultural identity. Qurratulain Hyder is Indian and her ethos oriental but the human nature she probes is to be found anywhere, and the suffering she depicts is universal. Her work is marked by a quality of vastness and magnitude both in time and space, and undoubtedly she has produced some of the unique fiction of our times. Let me briefly dwell on her improtant books that placed her firmly in the world of Urdu fiction.

Aag ka Darya, a novel, spanning Indian history from the 1950s back to the hoary past of Indian civilization, definitely to the times of the Buddha, is a witness to Qurratulain's uncanny vision that gives a unique depth and meaning to Time and Space. In this novel, her perspective as underscored by Aijaz Ahmad is universal and her concern,

humanity at large.

The story is spellbinding and fast-paced; the short, episodic narrative mode, keeps the attention of the reader always on a high. Gautam, the protagonist, a student in ancient times begins his peregrinations in the forest and eventually reaches the horrid times of Partition. Many a scene she portrays remain vivid in the readers' memory.

Qurratulain as if pulls off a double effect through writing in Urdu : "the implications of the theme, which appeals to genuine humanity and expresses the anguish of any sensitive mind, found avid readers wherever else the language was read and spoken, and yet it remained a thoroughly Indian book." It also deals comprehensively with the colonial past, especially looking at the advent of the English with the kind of critical acumen, seeking to give a thorough assessment of the Indian ethos down the ages.

Patjhar ki Awaz (The Voice of Autumn) is an outstanding collection of short and long stories and a novelette, "Housing Society". Handling with remarkable skill an outstanding variety of subjects and themes, and recreating history, Qurratulain Hyder is at her best in this collection. Her sensitivity to mood and situation and her considerable powers of characterization have no parallel in contemporary Urdu fiction. Most of the writings included in this volume are marked by the basic question of the predicament of human beings, the complexity of relations, and the unavoidability of time with a backdrop of the cultural cohesion and the cultural personality of the Indo-Gangetic people.

In "Jila-Watan" (The Exiles), one of her best long stories,

while underlining the humanistic aspects of the integrated Hindu-Muslim culture, or composite culture of the great cities of Northern India, she reflects on human suffering through the portrayal of vital experiences of the generation of those times in India and Pakistan, a generation which had passed through a profound historical change and turmoil, caused by Partition, Independence, and exile. In another story, "Dalan Wala" typical of her impressionistic style, she effectively employs past recollections and experiences capturing the dark and bright areas of human nature, and the underlying cultural unity of the Indian people.

"Patjhar ki Awaz," the title story, perhaps the only story of its kind by Qurratulain Hyder, depicts the predicament of a nymphomaniac, who, thirsting for love, in spite of the purity of her soul, passes from one man to another, and yet another by the sheer force of circumstances over which she has no control, and eventually in her grey days, feels like a fallen leaf drifted listlessly by the autumn winds.

Kare-e-Jahan Daraz Hai, the title of the next book, is after a line from Iqbal which means 'The task of the world is endless.' The author calls it a biographical novel. It is a breathtaking book because of its scope, diversity of narrative voices, and layers of references. From the first page it snares the reader in its web of history and memory, fact and fiction, and does not let one go till the end. It is the history of a family of Nahtor, Bijnaur, which begins in the 12th century and continues to the present. In the flowering of that particular family, however, there is also revealed to our riveted gaze the formation of that more general cultural identity, the Indian

Muslim and his composite patterns of sociological behaviour.

Akhir-e-Shab ke Hamsafar (Travellers unto the Night's End), is another outstanding novel by Qurratulain Hyder published from Bombay in 1978. It deals with one of the most fateful periods of the history of the sub-continent, i.e., from the pre-World War II terrorist activity in Bengal and the Quit India Movement to the Partition of the country, and then to the events of 1970 and the eventual emergence of Bangladesh. (The author's main concerns are psychological and existential in that, the once revolutionary characters who, inspired by high ideals, give up their everything for their ideology, but with the change of time, and driven by primitive impulses and desires, stoop to the level of ordinary beings given to greed and lust; and disillusioned, they seek careers of ordinary comforts and base pleasures. Qurratulain Hyder raises some basic questions about the nature of existence and human freedom, how people rise to heights pressed by challenges, but in fact, the dark areas always persist and the scope of choices is rather limited. It is a vibrant story of different families-Hindu, Muslim, Christian and English-interwoven with each other during these three decades of revolutionary fervour. The changes wrought by the impact of these eventual years on the mentalities, aims, moral values, ideals, and outlook of the characters are depicted with profound psychological insight, and the characters of the hero Raihan, the heroine Deepali, and the younger Yasmeen are hauntingly drawn. The atmosphere of East Bengal, now Bangladesh, its cities, rivers and jungles is also caught very vividly.

Qurratulain Hyder has an intense feeling for the immensity of pain, and for that cruel force called Time which overshadows all activity on earth. Time, in her fiction, is that faceless force that transforms all faces, which is linear as well as spiral, which one can ignore only at one's own peril, and which is so easily accessible, and is still so boundless as the universe itself. She urges us to recognize that the inevitability of change is the only reality, and that fact has one face of hope as well as another of sorrow. A linearly progressing Time brings changes, and change can be a harbinger of grief or joy. Should one then take sides? That would be too easy, she confides to us, too simplistic, for these issues cannot be settled by referring to the material world alone. What counts for Qurratulain Hyder is the human spirit and the relationships through which it blossoms forth. And that is where the linearity of Time turns into a spiral, bringing recognizable moments back to us if we have the necessary sensibility.

Many were the awards that came after Qurratulain Hyder besides the Sahitya Akademi Award and Jnanpith Award, of which two important ones are the Ghalib Award and Soviet Land Nehru Awards. She also was honoured with Padma Sri, Padma Bhushan, and the highest literary honour of the land, the Fellowship of Sahitya Akademi.

❍

# سوانحی کوائف : قرۃ العین حیدر

| | |
|---|---|
| نام | قرۃ العین حیدر |
| وطن | نہٹور (یو پی) |
| مقام پیدائش | علی گڑھ |
| تاریخ پیدائش | 20 جنوری 1927 |
| والدین | والد: سیّد سجاد حیدر یلدرم (1880-1943) |
| | والدہ: نذر سجاد حیدر (1894-1967) |
| تعلیم: | |
| | ابتدائی و ثانوی تعلیم : دہرہ دون، لاہور اور لکھنؤ |
| | انٹرمیڈیٹ : 1941 (ازابلا تھوبرن کالج، لکھنؤ) |
| | بی۔اے : 1945 (آئی، پی کالج، دہلی یونیورسٹی) |
| | ایم اے : 1947 (لکھنؤ یونیورسٹی) |
| | جدید انگریزی ادب کا کورس: 1952 ( کیمرج یونیورسٹی) |
| | آرٹ کی تعلیم : گورنمنٹ اسکول آف آرٹ، لکھنؤ/ ہیدرلیز اسکول (لندن) |
| | صحافت کی تعلیم : ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک، لندن |
| وفات | 21 اگست 2000 (شب تین بجے، کیلاش اسپتال، نوئیڈا) |

## تخلیقات/تصانیف

### افسانوی مجموعے:

| | | |
|---|---|---|
| ستاروں سے آگے | خاتون کتاب گھر، دہلی | (1947) |
| شیشے کے گھر | مکتبہ جدید، لاہور | (1954) |
| پت جھڑ کی آواز | مکتبہ جدید، لاہور/ مکتبہ جامعہ، دہلی | (1966) |
| روشنی کی رفتار | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | (1982) |

### ناولٹ:

| | | |
|---|---|---|
| سیتا ہرن | نیا دور، کراچی، طویل کہانی نمبر شمارہ (24,25) | (1960) |
| چائے کے باغ | حلقۂ ادب، بمبئی | (1964) |
| دل ربا | | (1976) |
| اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو | بیسویں صدی، دلی، جون 1977 | (قسط وار) |
| | | (1977) |
| چار ناولٹ | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | (1981) |

نوٹ: مندرجہ بالا چاروں ناولٹ کتابی صورت 'چار ناولٹ' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

### ناول:

| | | |
|---|---|---|
| میرے بھی صنم خانے | مکتبہ جدید، لاہور | اشاعت اوّل (1949) |
| سفینۂ غم دل | مکتبہ جدید، لاہور | اشاعت اوّل (1952) |
| آگ کا دریا | مکتبہ جدید، لاہور | اشاعت اوّل (1959) |
| آخر شب کے ہم سفر | چودھوری اکیڈمی، لاہور | اشاعت اوّل (1979) |
| کارِ جہاں دراز ہے (جلد اوّل) | مکتبہ اردو ادب، لاہور | اشاعت اوّل (1977) |

کارِجہاں دراز ہے (جلد دوم) مکتبہ اردو ادب، لاہور اشاعت اوّل (1979)
گردشِ رنگِ چمن مکتبہ دانیال، کراچی اشاعت اوّل (1987)
چاندنی بیگم ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی اشاعت اوّل (1990)
شاہراہِ حریر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی اشاعت اوّل (2002)

**تراجم:**

انگریزی سے اُردو:

ایلس ان ونڈر لینڈ رسالہ پھول، لاہور، قسط وار (1930)
ہمیں چراغ ہمیں پروانے
(ہنری جیمس کا ناول 'دا پوٹریٹ آف اے لیڈی') (1958)
آدمی کا مقدر (میخائل شولوخوف کا ناول 'دا فیٹ آف اے مین) (........)
الپس کے گیت (واسل بائی کوف) مکتبہ جامعہ، دہلی (1969)
ماں کی کھیتی (چنگیز اعتمادوف) مکتبہ جامعہ، دہلی (1966)
کلیسا میں قتل (مرڈر ان دی کیتھوڈریل، ٹی ایس ایلیٹ) (.........)
تلاش (بریک فاسٹ ایٹ ٹیفانی، ٹرومین کاپوٹ) (........)
تین جاپانی کھیل نقوش، لاہور (1960)
جن حسن بن عبدالرحمٰن (اوّل، دوم) مکتبہ جامعہ، دہلی (1962)
ناو؟ (بنگالی افسانہ، سید ولی اللہ) ماہِ نو، کراچی (1958)
رات کی بات (آسٹریلین کہانی) ہم قلم، کراچی (1960)
دا اسٹوری آف کے پنک کارپٹ تہذیبِ نسواں (........)

اُردو سے انگریزی:

غالب اینڈ ہیز پوئٹری (علی سردار جعفری اور قرۃ العین حیدر) پاپولر، ممبئی (1970)

اسٹوریز فرام انڈیا (خوشونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر) اسٹرلنگ، دہلی (1974)

دانوچ گرل از حسن شاہ اسٹرلنگ، دہلی (1992)

ڈانسنگ گرل از حسن شاہ امریکن ایڈیشن (1995)

نوٹ: ان کے علاوہ اقبال کی نیا شوالہ، فیض کی نظم، آغا بابر کی کہانی، ابن انشا، غالب، ابوالفضل صدیقی وغیرہ کو بھی ترجمہ کیا ہے۔

**اپنی تخلیقات کا ترجمہ:**

آگ کا دریا بعنوان The River of Fire

کالی فورہ یمن حوض خاص، نئی دہلی (1994)

آخر شب کے ہم سفر بعنوان Fireflies in the Mist

اسٹرلنگ (1994)

پت جھڑ کی آواز بعنوان The Sound of Falling Leaves

(.........)

جلاوطن (افسانہ) بعنوان The Exiles

پن پاکستان (1955)

اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو بعنوان A woman's life

چیتنا پبلی کیشن (1979)

چائے کے باغ بعنوان The Garden of Sylhet (........)

نوٹ: متعدد افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو امپرنٹ اور السٹریٹیڈ ویکلی میں شائع ہوئے۔

**ادب اطفال کے تراجم:**

لومڑی کے بچے، میاں ڈھینچوں کے بچے، ہرن کے بچے، ڈینگو، بہادر گھوڑا، بھیڑیے کے بچے، شیر خاں، جن حسن بن عبدالرحمٰن وغیرہ، یہ کتب ' مکتبہ جامعہ' دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔

**رپورتاژ:**

قرۃ العین حیدر نے کل گیارہ رپورتاژ لکھے ہیں، لندن لیٹر 1953 میں لکھا لیکن 1954 میں 'شیشے کے گھر' میں شائع ہوا۔ نقوش لاہور (1960)

ستمبر کا چاند نقوش، لاہور (1958)

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا نقوش، لاہور (1966)

درچمن ہر ورقی دفتر حال دیگر است نقوش، افسانہ نمبر، لاہور (1968)

کوہ دماوند آج کل، دہلی (1978)

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے ادبِ لطیف، لاہور (1983)

گلگشت مکتبہ اردو ادب لاہور (........)

جہان دیگر مکتبہ اردو ادب، لاہور (........)

خضر سوچتا ہے وولر کے کنارے (........)

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں (........)

پدماندی کنارے (........)

نوٹ: 'پدماندی کنارے' کو چھوڑ کر رپورتاژ دو مجموعوں کی صورت پاکستان میں 'سنگ میل' اور بھارت میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) نے شائع کیے ہیں۔

**رپورتاژ کے مجموعے:**

کوہ دماوند (چھ رپورتاژ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (2002)

ستمبر کا چاند (چھ رپورتاژ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (2002)

**مرتبہ کتابیں:**

دامان باغبان (خطوط کا مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (2003)

اُستاد بڑے غلام علی خان ہز لائف اینڈ میوزک (انگریزی میں، مالتی گیلانی اور قرۃ العین) ہر آنند پبلی کیشن، دہلی (2003)

کف گل فروش (اوّل: سیاہ و سفید تصاویر) اُردو اکادمی، دہلی (2004)
کف گل فروش (دوم: رنگین تصاویر) اُردو اکادمی، دہلی (2004)
ہوائے چمن میں خیمۂ گل (کلیات نذر سجاد حیدر)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (2004)

(نوٹ: ان کتابوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے مضامین اور خاکے بھی لکھے ہیں جو پس مرگ کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع ہوئے ہیں اور متعدد کتابیں ان کی شخصیت اور فن پر تحریر کی جا چکی ہیں جس کا احاطہ ڈاکٹر جمیل اختر نے کیا ہے۔ رسالہ 'آج کل' اور 'ایوان اردو' کی خصوصی اشاعت 'قرۃ العین حیدر نمبر' میں، قرۃ العین حیدر کے شخصی کوائف، کتابوں کی اشاعت اور انعامات کی تفصیل شائع ہوئی ہے۔ یہاں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔)

## اعزازات و انعامات

ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (افسانوی مجموعہ 'پت جھڑ کی آواز' پر) (1967)
سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ برائے تراجم (1969)
پرویز شاہدی ایوارڈ، مغربی بنگال اُردو اکادمی (1981)
اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ برائے مجموعی ادبی خدمات (1982)
غالب ایوارڈ (1982)
پدم شری (قومی ایوارڈ) (1984)
غالب مووی ایوارڈ (1984)
آندھرا پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ (1987)
اقبال سمان (حکومتِ مدھیہ پردیش) (1988)
بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ برائے 1989 (1990)
بھائی ویر سنگھ انٹرنیشن ایوارڈ (1991)

بھارت گورو، روٹری انٹرنیشنل (ادبی خدمات) (1991)

فیلو آف ساہتیہ اکیڈمی (1994)

کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (اردو اکادمی دہلی) (2000)

(نوٹ: قرۃ العین حیدر کو متعدد انعامات ملے ہیں جن میں سے اہم مندرجہ بالا ہیں۔)

○

# پروفیسر گوپی چند نارنگ مشاہیر کی نظر میں

سیفی سرونجی

جیسا کہ میں پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں کہ نارنگ صاحب کی زندگی کے کئی ایسے مختلف پہلو ہیں کہ ہر پہلو پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے کچھ لکھی بھی جا چکی ہیں، کچھ لکھی جا رہی ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا مثلاً 'نارنگ صاحب بحیثیت محقق و نقاد'، 'نارنگ صاحب کے بیرونی سفر'، 'نارنگ صاحب کی تقریریں'، 'نارنگ صاحب کی تصانیف و تالیفات'، 'نارنگ صاحب کے خطبات' اس طرح کے عنوانات کی لسٹ میں نے تیار کی ہے جو پچاس عنوانات پر مشتمل ہے اور ہر پہلو پر ایک کتاب ہونا چاہیے۔ اسی سلسلے کا ایک عنوان 'پروفیسر گوپی چند نارنگ: مشاہیر کی نظر میں' ہے، حالانکہ مشاہیر کی تمام آرائیں چھپ چکی ہیں اور چھپتی رہیں گی لیکن انھیں سلسلے سے لکھنا اور کتابی شکل میں پیش کرنا الگ بات ہوگی۔ میں اس کی شروعات تو دنیائے ادب کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر کی اس رائے سے کرنا چاہتا تھا جو انھوں نے بیماری کی حالت میں بھجوائی تھی۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ خود گوپی چند نارنگ صاحب کو پڑھ کر سنائیں لیکن ان کی صحت نے اجازت نہ دی اور مجبوری میں ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے وہ تاثرات پڑھ کر سنائے۔ افسوس! وہ ڈاکیومینٹری دستیاب نہیں ہوسکی جسے ہم آئندہ کبھی پیش کرسکیں گے۔ سچائی تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب کی شخصیت اور ان کے فن پر، ان کی تقریروں پر، تصانیف و تالیفات پر، اردو زبان اور لسانیات پر، ان کی تھیوری پر، ان کی تنقید اور دیگر مضامین پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ انھیں الگ الگ پیش کیا جائے تو کئی کتابیں ہوسکتی

ہیں۔ مشاہیر کی نظر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کیا اہمیت رکھتے ہیں، ان کا کیا مقام مرتبہ ہے یہ مشاہیر کی آرا سے ہم خوب سمجھ سکتے ہیں۔ نارنگ صاحب جب بھی لکھتے ہیں ان کی کتاب یک موضوعی ہوتی ہے اور اس میں ایک مرکزی Thesis ہوتا ہے جس پر مختلف ابواب، مختلف نکات کو مربوط طور پر پیش کرتا ہے تا کہ Thesis آسانی سے ذہن نشین ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی رسائل نے ان پر خاص نمبر شائع کیے ہیں، کئی کتابیں ان کی تقریروں، تحریروں پر مشتمل ہیں خاص طور پر انشا (کلکتہ)، اصناف ادب (پٹنہ)، انتساب عالمی (سرونج)، چہارسو (راولپنڈی)، کاروانِ ادب (بھوپال)، کتاب نما (دہلی)، عالمی زبان (سرونج)، سبق اردو (الہ آباد) جیسے کئی رسائل ہیں جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ اگر ہم غالب کی بات کریں تو یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ گوپی چند نارنگ نے غالب کو ازسرِنو دریافت کیا ہے اور ایسی کتاب لکھ ڈالی ہے کہ ماہرِ غالبیات حیرت زدہ رہ گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی نئی بستیوں میں، اردو کی اہمیت کو، اردو کے مستقبل کو روشن کرنے میں گوپی چند نارنگ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ بیرونی ممالک میں آج جو اردو کا چراغ روشن ہے اس میں گوپی چند نارنگ کارول سب سے بڑا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی تقریریں تحریریں تو اپنی جگہ ہیں میں نے اردو کا ایسا سچا عاشق آج تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھا کہ جس کے ذہن و دل میں اردو اس طرح رچی بسی ہے کہ آج تک کوئی تقریر ایسی نہیں جس میں لفظ اردو نہ آیا ہو۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے ہر لمحہ اُردو کے لیے سوچتے ہیں، اردو کے لیے جیتے ہیں۔ ایسے محسنِ اردو کی قربانیوں کو بھلا کون بھلا سکتا ہے جس کی رگ رگ میں اردو سمائی ہوئی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ جس نے اردو سے محبت کی ہے اردو نے اسے شہرت وعزت سے نوازا ہے۔ یہ بات خود پروفیسر نارنگ نے کہی ہے۔ خدا جب کسی کو کوئی مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے،

شہرت اور ہردلعزیزی بخشتا ہے، اس کے دل کو محبت کا سرچشمہ بنا دیتا ہے۔ گوپی چند نارنگ میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ وہ چھوٹوں سے پیار کرتے ہیں اور اپنے سے بڑے استادوں کا احترام کرتے ہیں، دوسروں کے کام آتے ہیں اور اردو سے محبت کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، اپنے دوستوں پر جان دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کئی قابل دوستوں، شاگردوں کو نوکریاں دلائیں، کئی ایوارڈ دلوائے اور آج کئی اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر بڑی شخصیت کے کچھ حاسد بھی رہے ہیں، لوگوں نے پیغمبروں کو نہیں چھوڑا پھر تو گوپی چند نارنگ تو عام انسان ہیں لیکن خدا جب دیتا ہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ وہ حاسدوں کو ناکام کر دیتا ہے اور جس سے حسد کیا جائے اسے اور اعلیٰ مقام و مرتبے سے نوازتا ہے۔ پروفیسر نارنگ کو یہ مقام و مرتبہ خدا نے بخشا ہے۔ آج ان پر اہلِ اردو کو فخر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان بھی ان پر نازاں ہے۔ اس سے پہلے ہم گوپی چند نارنگ صاحب پر 'انتساب عالمی' کا ضخیم نمبر اور نارنگ صاحب پر دو کتابیں 'گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید' اور 'مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ' شائع کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم چند مشاہیر کی آرا پیش کریں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ وہ تمام حضرات ہیں جنھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ پر بہت کچھ لکھا ہے کئی مضامین، کئی کتابیں نارنگ صاحب کی شخصیت اور فن پر لکھ چکے ہیں۔ مشفق خواجہ تو ایک ایسی ہستی تھے کہ جن کا ایک کالم ہی ساری ادبی دنیا میں ہلچل مچا دیتا تھا۔ وہ جس پر کالم لکھ دیں تو شخصیت راتوں رات شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جاتی تھی۔ پروفیسر نارنگ صاحب پر مشفق خواجہ نے ایک زبردست مضمون لکھا جو کئی کتابوں رسالوں میں شائع ہو چکا ہے، حالانکہ یہاں ہم مشاہیر کی مختصر مختصر رائے پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر رائے میں بھی لکھنے والوں نے نارنگ صاحب کی پوری شخصیت اور کارناموں کو سمیٹ لیا ہے۔ مشفق خواجہ نے نارنگ صاحب کو 'ماہر لسانیات' ہونے کی سند عطا کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین کا حوالہ دیا ہے کہ گیان چند جین جو

کسی کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی نارنگ صاحب کو ماہر لسانیات قرار دے چکے ہیں۔ قمر جمیل پاکستان کی نامور ہستیوں میں شامل کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے نارنگ صاحب کی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' کو بہت اہم قرار دیا ہے بلکہ یہ تک کہہ دیا ہے کہ اب تک ادبی دنیا میں اس سے پہلے اس نوعیت کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ سچائی تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب نے اپنی زندگی کے تمام گہرے مشاہدات اور مطالعات کی روشنی میں جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہی معاملہ پاکستان میں ناصر عباس نیر اور قاضی عابد اور ہندوستان میں بالخصوص شافع قدوائی صاحب کا بھی ہے جن کی کئی کتابیں شائع ہو کر نئی روشنی پھیلا چکی ہیں۔ ویسے پاکستان میں یہ کام بڑے پیمانے پر قمر جمیل اور فہیم اعظمی نے اپنے اپنے رسالوں میں یعنی 'دریافت' اور 'صریر' کے ذریعے کیا تھا۔ زبان سے متعلق نارنگ صاحب کے مضامین، تقریریں اور اردو سے محبت کا جنون بھی دیکھا جا سکتا ہے، لیکن جب وہ کوئی تحقیقی مضمون لکھتے ہیں تو اس میں ان کی علمیت، قابلیت اور مطالعہ کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کوئی بات بغیر دلائل کے نہیں کرتے۔ ہر بات ٹھوس ثبوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری معتبر ادیب و نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کی ادارت میں 'نگار' جیسا پرچہ ہمیشہ پابندی سے نکلتا رہا جس کی ساری ادبی دنیا میں دھاک تھی۔ وہ ایک بڑے محقق نقاد تو تھے ہی، ایک بڑے صحافی کی حیثیت سے بھی ان کا نام نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔ وہ نارنگ صاحب کو اس عہد کا صفِ اوّل کا ادیب و محقق نقاد قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ نارنگ صاحب کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس پر ادبی دنیا میں ہلچل پیدا نہ ہوئی ہو۔ انتظار حسین نے نارنگ صاحب کی مابعد جدیدیت کے حوالے سے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ نیا ذہن سماجی و سیاسی مسائل سے غیر وابستہ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی کتنا صحیح لکھا ہے کہ نارنگ صاحب کسی ایک حصار میں بند نہیں کیے جا سکتے بلکہ ہر پل نیا سوچتے ہیں

اور صرف سوچنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور ہر فیلڈ میں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

نارنگ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی ان سے اختلاف بھی کرتا ہے تو وہ غصے میں نہیں آتے بلکہ اپنے علم کی روشنی میں اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مابعد جدیدیت نارنگ صاحب کا پیش کردہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس پر بہت سے اعتراض بھی ہوئے اور بہت سے نقادوں نے حمایت بھی کی اور یہ بحث اب تک جاری ہے لیکن اس سے ایک فائدہ نئی نسل کو ہوا کہ جدیدیوں نے نئے لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دی، اچھے لکھنے والوں کو بھی نظرانداز کیا تب یہ فلسفہ وفکر وجود میں آیا اور نارنگ صاحب اس کے بانی اور رہنما کہلائے جبکہ نارنگ صاحب خود کہتے ہیں کہ وہ کسی چیز کے بانی اور رہنما نہیں ہیں۔ وہ صرف اس فکر و فلسفے کو سمجھاتے ہیں اور اس کی تفہیم کرتے ہیں کہ کوئی ادب میں حکم نامہ جاری نہیں کرسکتا۔ سچا اور کھرا ادب ہمیشہ حکم ناموں کو اور اوپر سے لادے ہوئے مبنی فیصلوں میں تسلیم نہیں کرتا۔ ادب میں پہلی شرط ادیب کی آزادی ہے۔ کئی نظیر آئے اور انھوں نے اپنے ہی حکم ناموں سے خود کو شہید کیا۔ مابعد جدیدیت یعنی آج کی سوچ ہر اس نظریے کو نکارتی ہے جو ادیب کو کسی League پر چلانا چاہے۔ قارئین کو یاد ہوگا جب علی سردار جعفری نے فیض احمد فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' جو یومِ آزادی پر تھی، اس پر اعتراض کیا تھا کہ یہ ترقی پسندی کے مطابق ہے۔ فیض اور سجاد ظہیر اس وقت جیل میں تھے۔ فیض صاحب نے اس اعتراض کو کوئی اہمیت نہیں دی اور یہ کہہ کر حکم نامے نافذ کرنے والوں کو رڈ کر دیا کہ ہمارا تو جو دل کہے گا وہ ہم کہیں گے (جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے)۔ یہ ادب کی آزادی کا کھلا اعلان تھا لیکن ترقی پسندی کے بعد جدیدیت نے بھی کئی طرح کے الٹے سیدھے حکم نامے اپنے رسالے میں جاری کیے اور کئی رنگ بدلے۔ آخر آخر جدیدیت کو سماجی اور انسانی مسائل سے الگ تو کیا ہی تھا تخلیقیت،

آزادگی، بھائی چارے، انسانی وحدت اور سماجیت کا گلا ہی گھونٹ دیا اور فقط بدی و بیان اور بے معنی ہیئت پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جدیدیت نے بھی اپنے ہی حرفوں سے خودکشی کی۔ نارنگ صاحب کشادگی، انسان پرستی، محبت، اخوت، حدت اور سماجیت کے حق میں ہیں۔ ادیب کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ نہ صرف زبان و بیان، مختلف جمالیات اور سماجی مسائل کا حق ادا کرے بلکہ ہر ہر قدم پر ادب کی وحدت، آزادگی، امن اور بھائی چارے کا دفع کرے۔ آج اردو ادب میں جو کھلی فضا ہے اس میں نارنگ کی سوچ کا بڑا ہاتھ ہے کہ کوئی نظریہ آخری نظریہ نہیں ہوتا۔ ادب اوّل اور آخر اپنے آپ میں سماجیت اور انسانیت کا نقیب ہے اور ان سب کے دفاع کے لیے جواب دہ ہے۔

اس طرح نئی نسل مایوسی کے دور سے نکل کر خوداعتمادی کے دور میں داخل ہوئی۔ نظام صدیقی جنھوں نے نارنگ صاحب پر کئی مضامین لکھے ہیں، نظام صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی تنقید سب سے جدا ہے۔ وہ الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ تنقید میں شناخت قائم کرنا آسان کام نہیں ہے، لیکن نظام صدیقی کی ایک لائن پڑھ کر قاری سمجھ لیتا ہے کہ یہ نظام صدیقی کی تنقید ہے۔ محمد ایوب واقف نے پروفیسر گوپی چند نارنگ پر ایسا زبردست مضمون لکھا کہ جو سات رسالوں میں اور کئی مختلف کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ شمیم طارق نئی نسل کے ممتاز محقق نقاد ہیں جنھوں نے صوفیانہ تحریکات سے لے کر صوفی ادب پر کئی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ شمیم طارق نے پروفیسر نارنگ کو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار قرار دیا ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے یوں تو نارنگ صاحب پر کئی مضامین لکھے ہیں لیکن ان کی ایک ضخیم کتاب 'دیدہ ور نقاد' بھی نارنگ صاحب کی شخصیت اور فن پر شائع ہو چکی ہے۔ شہزاد انجم نے نارنگ صاحب کو ہندو مسلمان اتحاد اور تہذیب کا بڑا نام قرار دیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر خالد محمود نے اپنے مضمون کے آخر میں خوبصورت رائے پیش کی ہے کہ پروفیسر

گوپی چند نارنگ بھی انسان ہیں، ان سے بھی غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں یقیناً ان میں بھی کوئی خامی ہوگی، لیکن جو خوبیاں ان میں ہیں وہ کسی دوسرے میں نہیں۔ ڈاکٹر اسد رضا ایک اچھے انشائیہ نگار اور خاکہ نگار ہیں، انھوں نے بہت خوبصورت انداز میں نارنگ صاحب کا خاکہ لکھا ہے۔ حقانی القاسمی نئی نسل کے ایک اہم نقاد ہیں انھوں نے نارنگ صاحب کے شخصی کمالات اور ان کی ادبی فتوحات پر گہرائی سے نظر ڈالی ہے۔ ابوذر ہاشمی نے اردو غزل اور ہندستانی تہذیب کے حوالے سے نارنگ صاحب کی اس کتاب کو ہندستانی تہذیب کی عکاسی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی اردو کے علاوہ انگریزی کے بھی ممتاز مصنف ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ نارنگ صاحب نے ثقافتی حوالوں اور اساطیر کے تفاعل پر اصرار کر کے تنقید کا ایک نیا محاورہ قائم کیا ہے اور اس نقطہ نظر کے کئی جہات سے پردہ اٹھایا ہے۔ چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں:

**قمر جمیل (کراچی)**

حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی جو نئی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' آئی ہے وہ مولانا حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کے بعد اردو تنقید کا سب سے اہم سنگِ میل ہے، سب سے اہم موڑ ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات کے مباحث ایک طویل عرصے سے 'دریافت' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فکشن کی شعریات، ردتشکیل، قاری اساس تنقید، سنسکرت شعریات پر نارنگ صاحب کے مضامین اردو میں انتہائی قیمتی اضافہ ہیں۔ مغرب کے ہر اس مفکر کے بارے میں جس نے ساختیات پر کوئی اضافہ کیا ہے، اس کتاب میں بے مثال گفتگو مل جائے گی اور پھر مابعد جدیدیت کے مسائل بھی اٹھائے ہیں۔ تنقید کے نئے ماڈل کی ایسی نشاندہی کی ہے جس کی مثال اردو ہی میں کیا غیر ملکی زبانوں میں بھی کم نظر آتی ہے۔ حالی کی کتاب میں جس مغربی فکر کی تھوڑی سی جھلک ملتی ہے وہی مغربی

فکر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نارنگ صاحب کی اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ سنسکرت، فارسی اور عربی شعریات پر نارنگ صاحب کو جو عبور حاصل ہے وہ اردو کی شاید ہی کسی کتاب میں نظر آئے، بلکہ یہ انتہائی غلط ہوگا اگر میں یہ نہ لکھوں کہ اردو میں اب تک تنقید تھیوری پر اس سے زیادہ معتبر اور اہم کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ مجھے اس میں شبہ نہیں کہ یہی کتاب اردو کی نظریاتی تنقید کی سب سے بڑی کتاب ثابت ہوگی۔

**ڈاکٹر فرمان فتح پوری**

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ عہدِ حاضر کے ان لکھنے والوں میں ہیں جن کا شمار صفِ اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ادیب اور صفِ اول کا ادیب ہونا عمر بھر کی ریاضتِ قلم کا حاصل و مطالعاتی شغف کا ثمر ہوتا ہے، چنانچہ یہ رتبۂ بلند سب کو نہیں کسی کسی کو میسر آتا ہے، بقول شاعر:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس عظیم منصف پر فائز ہونے والے صاحبِ قلم کو بعض نے اسکالر اور دانشور کا نام دیا ہے، بعض نے نقاد و محقق کے نام سے پکارا ہے اور بعض نے زبان و ادب کے نبّاض و مزاج شناس سے موسوم کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر نارنگ کو ان کے علم و فضل اور اُن کی لسانی و ادبی خدمات کے حوالے سے خواہ کتنے ہی القاب سے ملقّب اور کتنی ہی صفات سے متصف کریں آخر کار بالا جمال یہی کہنا ہوگا کہ وہ صفِ اوّل کے ادیب ہیں۔

**مشفق خواجہ (لاہور)**

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔

وہ اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی نقادی کا لوہا فضیل جعفری جیسے تند مزاج نے بھی مانا ہے، جو اپنے علاوہ کسی اور کو نقاد ماننے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہیں۔ اپنے بارے میں اس لیے نہیں سوچتے کہ مسلمات پر بحث کرنا ان کی عادت نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کو ماہر لسانیات ہونے کی سند ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی عطا کی ہے، جو خود اس میدان کے شہسواروں میں سے ہیں اور شہسوار بھی ایسے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے جید عالم کو بھی اپنے توسنِ لسانیات کی بھی گرد بنا ڈالا تھا اور بعد میں معذرت بھی کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ کے سلسلے میں وہ معذرت کا ارادہ نہیں رکھتے۔

**انتظار حسین (کراچی)**

ہندوستان کا ایک نمائندہ یہاں آیا ہے اور وہ ہمیں ایڈریس کر رہا ہے تو پورے ہندوستان کی گویا وہ نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ باقی جو ادیب ہوتے ہیں، ان کی یہ حیثیت نہیں بن پاتی لیکن نارنگ صاحب کی یہ حیثیت ہے کہ جب وہ پاکستان جاتے ہیں اور پاکستان کے کسی اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں اور خطاب کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ پورا ہندوستان ہم سے خطاب کر رہا ہے۔

**انتظار حسین**

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی یہ بات نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے کہ جس طرح ترقی پسندوں کی حماقتوں سے سبق سیکھنے کی ضرورت تھی اسی طرح جدیدیت والوں کی حماقتوں سے بھی سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پتے کی بات یہ ہے کہ ادب آئیڈیالوجی سے بیگانۂ محض بھی نہیں۔ یہ وہ حماقت ہے جو جدیدیت والوں نے ترقی پسندوں کی ضد میں کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ بلا اصرار کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت یا نیا ذہن سماجی و سیاسی مسائل سے غیر وابستہ نہیں ہو سکتا۔

**انتظار حسین**

میں جب اپنے حساب سے دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی تین کتابوں کا جو سلسلہ اب جاری ہوا ہے مجھے سب سے زیادہ اہم اور تاریخ ساز کام نظر آتا ہے۔ وہ تین کتابوں کا سلسلہ اس طریقے سے ہے کہ انھوں نے جس طریقے سے اردو زبان پر کام کیا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں، ہندوستان کی فکر میں اور ہندوستان کے احساس کی تہہ میں اردو زبان اور اردو ادب کی جڑیں کس طریقے سے پیوست ہیں۔ پہلی کتاب جو ہے وہ اردو مثنویوں کے حوالے سے ہے۔ انھوں نے جس طریقے سے ہمارے سامنے اس کا تجزیہ کیا اور توضیح کی ہے تو یہ ساری اردو مثنویوں کی جو روایت ہے، پتہ چلتا ہے کہ عجم سے تو اس کا سرسری تعلق ہے اصل میں ہندوستان کی سرزمین میں اس کی جڑیں ہیں، بلکہ وہ قصے بھی جو کہ عجم و عرب سے آئے وہ اردو مثنوی میں آکر Indianize ہو گئے۔

اس کے بعد جو سب سے زیادہ مشکل کام مجھے نظر آیا اور جس کے لیے بڑی گہرائی کی ضرورت تھی وہ ہے ان کا اردو غزل کا مطالعہ۔ اردو غزل کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ عجمی روایت کی پیداوار ہے، فارسی غزل سے اس کا تعلق ہے اور اس کے سارے Symbols جو ہیں، ساری تلمی ہیں، یعنی تلمیحات وہ سب وہاں سے آئی ہیں اور اس پر اعتراض بھی یہی ہوتا تھا۔ جو اردو کے مخالف تھے وہ کہتے تھے کہ اس صنف کا تعلق تو اِس سرزمین سے ہے ہی نہیں، اس کے پرندے جو ہیں وہ بھی وہاں سے آئے ہیں اور اس کے جو استعارے ہیں، تلمیحات ہیں وہ سب عجم اور عرب کی دنیا سے آئی ہیں۔ لیکن جس طریقے سے اس پر نارنگ صاحب نے کام کیا ہے اور انھیں بتایا ہے کہ اس میں جو عشق کا تصور ہے، یا حُسن کا تصور اس میں ہے تو اس کا انھوں نے تجزیہ کیا اور کہا کہ یہ وہ تصور ہے ہی نہیں جو فارسی غزل میں آپ کو نظر آئے گا یا عربی کی شاعری میں نظر آئے گا۔ یہاں جو حُسن کا تصور ہے، ہندوستان کی جو فکری روایت ہے اور جو جمالیاتی روایت ہے تو Vedic عہد سے وہ چلے ہیں اور وہاں سے تجزیہ

کرتے کرتے بتایا ہے کہ حُسن اور عشق کا تصور جسے ہندوستان کی فکر نے جنم دیا ہے اور ہندوستان کے جذبات اور احساسات نے جس کی پرورش کی ہے تو وہ تصور جو ہے غزل میں آیا ہے۔ اردو غزل جو ہے ان کا Thesis یہ ہے، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ فارسی غزل سے بالکل مختلف چیز ہے، میرے خیال سے یہ ایک ایسا تجزیہ ہے جو بالکل تاریخ ساز، سارا تصور جو اردو شاعری کے بارے میں ہے اس تحقیق کے بعد بدل جاتا ہے۔ یہ ساری جدید تاریخ ہے ہندوستان کی، اس میں اردو زبان اور اردو شاعری کا کتنا عمل دخل ہے مثلاً یہاں کی تحریکِ آزادی میں یعنی اردو شاعری نے کس طریقے سے حصہ لیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی تیسری کتاب ہے 'ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ' مثلاً جو مشہور شعر ہیں جو بالکل Folk شاعری بن گئے ہیں وہ اردو کے شعر ہیں یا جو نعرے آئے 'انقلاب زندہ باد'، اس قسم کے وہ سارے اردو سے مستعار ہیں۔ اب تحریکِ آزادی جسے کہتے ہیں اور زبانیں بھی ہیں؛ ہندی زبان ہے ان کا اپنا کنٹری بیوشن ہے، لیکن جس طریقے سے اردو زبان نے اس تحریک کو فیض پہنچایا ہے اور تقویت دی ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ یہ تین کتابوں کا سلسلہ ہے وہ اتنا اہم ہے اور اتنا تاریخ ساز ہے کہ اس سے اردو زبان اور اردو شاعری کے بارے میں ہمارا پورا تصور ہی بدل جاتا ہے اور وہ سارے اعتراضات جو ہوتے رہے ہیں اس روایت پر اور اس زبان پر کہ اس کا اِس دھرتی سے ناطہ نہیں ہے وہ سب بالکل دھوئیں کی طرح اُڑ جاتا ہے۔ تو میرے خیال میں یہ بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے اور میں اس کے لیے نارنگ صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ یہ کام کوئی بڑا محقق اور بڑا نقاد ہی کر سکتا تھا چھوٹے قد کے نقاد اور محقق کی بس کی بات نہیں تھی۔

## گیان چند جین

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے محقق ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ دعویٰ تو وہ نقاد ہونے، ماہر لسانیات ہونے یا مفکر ہونے کا بھی نہیں کرتے۔ اپنے زیادہ تر بیانات میں

انھوں نے خود کو 'طالب علم' کہا ہے۔ البتہ انھوں نے ایک جگہ ضرور لکھا ہے کہ "ان کے کام کی ابتدا ادبی تحقیق سے ہوئی"۔ تب میں نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا ہوگا۔ اب نظر بہ گزشتہ ڈالتا ہوں تو خود کو اعتراف کرنے پر مجبور پاتا ہوں کہ غالباً وہ اردو میں پہلے آدمی تھے جنھوں نے اردو مثنویوں میں ہندستانی قصوں کی تحقیق اور امیر خسرو کے ہندوی کلام کی تحقیق کو لے کر اردو کی عوامی روایت اور لوک ادب کی بازیافت پر جم کر کام کیا اور اپنے اس کام کے ذریعے اردو تحقیق کی سخت گیر اور بے لچک روش پر پُراعتماد احتجاج بھی کیا۔

## پروفیسر قمر رئیس

بیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو کی ادبی تنقید کے دُھندلے افق پر جو ستارے روشن ہوئے ان میں گوپی چند نارنگ کا نام امتیاز خاص اس لیے رکھتا ہے کہ اس درخشاں ستارے کی آب و تاب میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ایک منفرد اور معتبر نقاد کی حیثیت سے ان کی مقبولیت میں مسلسل توسیع ہوتی رہی۔ معاصرین پر ان کے اثرات کا گراف بڑھتا رہا۔ بعض دوسرے معاصرین کی طرح ان کے اس مشغلے میں جمود و تعطل کے آثار کبھی دکھائی نہیں دیتے۔

## پروفیسر حامدی کاشمیری

یاد رہے کہ اپنے عہد کے حالات کے شعور سے بہرہ مند یا متاثر ہونا ایک بات اور اسی کا تابع مہمل یا ترسیلیت کار ہونا دوسری بات ہے۔ اس میں معاصر صورت حال اور اس میں کشادگی اور آزادگی کے تقاضوں کا جن چند لوگوں کو ادراک ہوا، ان میں گوپی چند نارنگ پیش پیش ہیں۔ انھوں نے ادیب کی آزادانہ ذہنی تاثر پذیری پر زوردار وکالت کرتے ہوئے کسی نظریے میں حصار بند ہونے کو غلط ٹھہرایا۔

## جوگندر پال

نارنگ اپنے دور میں ادبی اٹھک بیٹھک کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تنقیدی لائحہ عمل میں تبدیلیوں کی گنجائش برابر رکھتے رہے۔ جس طرح کوئی شخص واحد چھوٹے سے بڑا ہوتا ہے بعینہٖ انسانی تحریکیں بھی بڑی اور بالغ نہ ہوتی چلی جائیں اور ان میں مناسب تبدیلیاں ممنوع قرار دی جائیں تو ہوتے ہوتے وہ بے مصرف ہوکر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ نارنگ نے نئی صورت حال میں اپنی سوچ میں نیا پھیلاؤ محسوس کیا تو رائج جدیدیت کی دھاندلیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی ذمے داری قبول کیے بغیر نہ رہ سکے اور نئے دور کی تخلیقی ضرورتوں کے پیش نظر ادب کے قارئین کو مابعد جدیدیت سے روشناس کرانے کی ٹھان لی۔

## مخمور سعیدی

یہ کہنا بار بار کہی ہوئی بات کو دہرانا ہوگا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک شش جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ بالغ نظر ادبی نقاد، ثقافتی دانشور، تہذیبی مفکر، ان کی کئی حیثیتیں ہیں اور یہ سبھی حیثیتیں پوری اردو دنیا میں جانی جاتی ہیں۔ اردو دنیا ہی کیا، دوسری کئی زبانوں میں بھی ان کی علمیت کی دھوم ہے لیکن انھوں نے مختلف سطحوں پر اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اردو کی جڑوں کی تلاش و تحقیق کا معاملہ یا اردو کے تہذیبی و تمدنی تفاعل کا، نارنگ صاحب نے جس ذہنی انہماک اور جس خبر رسی کے ساتھ بہت سے مشکل سوالوں کو آسان کر دکھایا ہے وہ انھیں کا کام ہے۔

## گلزار

نارنگ صاحب کی انگلی، ان کا ہاتھ ہر وقت ادب کی نبض پر رہتا ہے اور وہ صرف اردو اور ہندی کا Literature ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر بھی ان کی

نظر رہتی ہے۔ World Literature کے Mainstream سے آگاہ نظر آتے ہیں اس لئے ان کا Perspective بہت بڑا ہے۔ ماڈرنزم بھی، پوسٹ ماڈرنزم پر جب وہ بات کہتے ہیں تو پوری کھل کر واضح ہوکر بات سامنے آتی ہے۔

دو پاؤں پہ بہتا دریا ایک پاؤں پہ ٹھہری جھیل
جھیل کی نابھی پر رکھی ہے اردو کی روشن قندیل

**پروفیسر شافع قدوائی**

گوپی چند نارنگ نے ادب کے مطالعہ میں ثقافتی حوالوں اور اساطیر کے تفاعل پر اصرار کرکے ایک نیا تنقیدی محاورہ قائم کرنے کی کوشش کی اور اسلوبیاتی خصائص کو بھی مرکز بنایا۔

**نظام صدیقی**

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نئی تھیوری کے نئے رخ کی مزید فکریاتی اور جمالیاتی رعنائی اور توانائی کے لیے سنسکرت شعریات اور عربی و فارسی شعریات کا نہایت معنی خیز سہ طرفہ مکالمہ نئی تھیوری کے دوسرے اردوئی مابعدجدید تناظر میں پہلے ہی ہمیشہ کے لیے قائم و دائم کر دیا ہے۔ اس کا فکریاتی اور حُسن یاتی فیضانِ جاریہ ہمیشہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوگا۔ یہ ہماری اپنی Towards Orient پالیسی کے مطابق ہے۔

**پروفیسر ابولکلام قاسمی**

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتابیں 'اردو غزل اور ہندستانی ذہن وتہذیب' اور 'ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری' ان دو کتابوں کے ذریعے نقطۂ نظر اور رویے کو بنیادی اہمیت دی۔ ادب کی آفاقی قدروں کو وسیلہ بنا کر مخصوص تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو نشان زد کیا ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی شناخت کو نشان زد کرتے ہوئے آفاقیت اور مقامیت کی کشاکشی کو ادب کے حوالے سے بڑی گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

## محمد ایوب واقف

جناب گوپی چند نارنگ صاحب اردو زبان و ادب اور ہم اردو والوں کے لیے ایک ایسے متبرک اور عطیۂ خداوندی ہیں کہ جس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ دو چار سال سے نہیں بلکہ گزشتہ ساٹھ سال سے عالمی سطح پر اردو کے ایسے معرکۃ الآرا، عظیم الشان اور پائیدار سفیر ہیں کہ جس کی زبان پر ترانۂ اردو کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ اردو کی شان و عظمت کے نشان اور اس کی علامت (Insignia) ہیں۔ ان پر یہ رشک کرنا کہ وہ اردو زبان اور مسلم قوم کے لیے دشنام آمیز (Opprobrium) کلمات استعمال کرنے والے کسی شخص کے حامی و طرفدار ہوں گے محلِ نظر ہے ہم ایسے تمام شکوک و شبہات کو بیک قلم خارج کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جناب گوپی چند نارنگ اپنی زندگی کے ہر دور میں اردو زبان، اس کے رسم الخط اور اس کے شاندار ادب کے ترجمان اور نگہبان رہے ہیں۔

## پروفیسر علی احمد فاطمی

گوپی چند نارنگ حسن و عشق، جمال و اشباب کے ہر عمل کو تہذیب کے مظاہر مانتے ہوئے اس میں ارضیت، مقامیت، ثقافت اور زندگی کی معنویت تلاش کر لیتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب تصور واضح ہو، نقطۂ نظر صاف اور نظر گہری اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہو، فکر کا ارتباط، تسلسلِ بیان اور معنیاتی نظام پر حرف نہ آنے پائے۔ نارنگ ایک نہایت کڑھے اور سجے ہوئے انداز میں اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں کہ فکر و معنی خوشبو کی طرح رچتے بستے چلے جاتے ہیں۔

## پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پینتالیس برس قبل ذہن و ضمیر کی آزادی کا جو تصور قائم کیا تھا اسے انھوں نے آج تک قائم رکھا ہے جو بھی نیا رجحان، نئی تحریک نیا ٹرینڈ

سامنے آیا اس کا تعارف انھوں نے نئی نسل سے کرایا اور یہ سلسلہ لگاتار جاری ہے۔

**پروفیسر صادق**

گزشتہ برسوں میں جن جدید نقادوں نے اردو فکشن کی تنقید کو اعتبار کا درجہ عطا کیا ہے ان میں گوپی چند نارنگ کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ گوپی چند نارنگ بنیادی طور پر فکشن ہی کے نقاد ہیں مگر بعدازاں لسانیات کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ لسانیات سے ایک رابطۂ خاص کے باوجود انھوں نے فکشن کی تنقید سے منہ نہیں موڑا۔ ہندستانی قصوں سے ماخوذ مثنویوں کا مطالعہ ایک تحقیقی مطالعہ تھا جس کے توسط سے وہ کلاسیکی مشرقی ادب کے ان سلسلوں تک پہنچے تھے جن پر ہماری نظر بہت کم گئی تھی بلکہ یہ وہ سلسلے تھے جو آہستہ آہستہ ہماری یادداشتوں سے مٹتے جا رہے تھے۔

**شمیم طارق**

اُردو رسم الخط ہندستانی ہے اوراس کو تبدیل کرنا صرف اردو کی انفرادیت سے دستبردار ہو جانے کے مترادف ہے بلکہ قومی یکجہتی، لسانیاتی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی ناقابل عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو رسم خط سے متعلق نارنگ کا موقف اردو بولنے لکھنے والوں کے اجتماعی شعور ولاشعور کو سائنسی بنیاد دینے کی آواز ہے۔

**پروفیسر شہزاد انجم**

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علمی سفر کی نصف صدی سے زیادہ مدّت مکمل ہو چکی ہے۔ انھوں نے اردو تنقید کو فلسفہ ادب کی نئی بصیرتوں سے مالا مال کیا ہے اور نظریہ سازی پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کی پوری شخصیت اس عظیم ہندستانی کلچر اور تہذیب کی روح کا حسین امتزاج ہے جو ہمارا تہذیبی وثقافتی ورثہ ہے۔ پروفیسر نارنگ نے ہمیشہ اپنی تحریروں وتقریروں میں مشترک تہذیب اور اردو ادب کی ان بنیادی قدروں پر گفتگو کی ہے جو ہندوؤں مسلمانوں کے ارتباط سے وجود میں آئیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ

انھوں نے جس ادارے میں قدم رکھا اس کی رہنمائی و سربراہی کی، وہ ادارہ اپنی قسمت پر نازاں ہوا اور رشک کرنے لگا۔

**پروفیسر خالد محمود**

نارنگ صاحب کے عہد میں مکمل کیے گئے اور آغاز کیے گئے تمام کاموں کا تفصیلی جائزہ اور ان کے انٹرویوز جو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں جن کی روشنی میں ان کاموں کی وسعت و اہمیت اور مقدار و معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں بھی اس بات کا ادراک و احساس ہے اور وہ کھلے دل سے اس حقیقت کا واشگاف انداز میں اعتراف کرتے ہیں۔ اردو نارنگ صاحب کا عشق ہے۔ یہ عشق انھیں کسی وراثت کے تحت یا ترکے میں نہیں ملا بلکہ اردو کی زلفِ گرہ گیر نے انھیں خود اسیر کیا ہے۔ ان کی تقریر و تحریر کے ایک ایک جملے اور ایک ایک سطر سے ان کے عشق کا اظہار ہوتا ہے اور اسی عشق کی وجہ سے آج وہ اردو دنیا کی مقبول ترین ہستیوں میں شامل ہیں۔

**حقانی القاسمی**

گوپی چند نارنگ حُسن شیم، شمائل حمیدہ، حلوِ کلام سے متصف ہیں۔ وہ معدن ِصدق و صفا ہیں۔ ان کے شخصی کمالات اور فتوحات کی داستان 'شب ہجراں' سے زیادہ دراز ہے۔ ان کے حسود و نقود بھی ان کے شخصی اور تخلیقی وجود میں نظافت، نفائت اور نعومت سے انکار نہیں کرتے۔ ان کے معارض مابعد جدیدیت کو مسترد کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نارنگ غیر مشروط ذہن کے ساتھ تخلیق شناسی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور تلف سے کام نہیں لیتے۔ آج جبکہ ادب میں محاکرہ کی مکروہ روایت اپنی شدت کو پہنچ چکی ہے، نصِ حقائق تک پہنچے بغیر جہاں نئی نسل کے نیم فہم ناخواندہ ناقد نظریے کے ناسخ بنے پھرتے ہیں وہیں نارنگ اپنے نقیص کو نکارتے ہوئے بھی ملاطفت اور تمکنت کا ثبوت دیتے ہیں۔

**پروفیسر مناظر عاشق ہر گانوی**

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ساختیاتی مارکسیت اور نئی مارکسیت کا تنقیدی تعارف بھی باضابطہ طور پر تھیوری کی پوری آگہی کے ساتھ سب سے پہلے گوپی چند نارنگ نے کر دیا۔ تعجب یہ ہے کہ یہ توفیق نئے پرانے ترقی پسندوں میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور اس راہ میں پہلا قدم نارنگ ہی کو اٹھانا پڑا۔

**کوثر صدیقی**

نارنگ صاحب اجتہادی فکر وعمل کے انسان ہیں۔ انھوں نے زبان اور علم زبان سے متعلق بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ ان کا تازہ معرکہ مابعدجدیدیت کی کشادگی آموز تحریک ہے۔ اس تاریخی تحریک کے وہ قائد بھی ہیں اور شارح بھی یہ ان کی شخصیت کا ایسا پہلو ہے جس پر آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا اور نارنگ صاحب کو بھی اردو کی جھولی میں اپنے قیمتی خیالات وافکار کی کتنی دولت اُنڈیلنی ہے یہ بھی آنے والا وقت بتائے گا۔

**ابوذر ہاشمی**

اگر ہم یہ کہیں کہ 'غزل رنگ نارنگ' نے پہلی بار اردو غزل کا مبسوط اور مربوط مطالعہ ہندستانی ذہن اور تہذیب کے پس منظر میں ناقابل تردید دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ لیکن اس دعوے کی دلیل آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کے مصداق نارنگ کی وقیع وضخیم کتاب 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب' اس دعوے کی وہ تنقیدی وتحقیقی دلیل ہے جو مطالعۂ غزل کو ایک نیا سیاق فراہم کرتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا کوئی مورخ اس سیاق کو نظرانداز نہ کر سکے گا۔

**رضا علی عابدی**

بلوچستان کی خشک اور بنجر زمین سے اٹھے اور اردو کی ہری بھری سرسبز زمین پر چھا گئے۔ اس زبان کو نصف صدی سے زیادہ زمانے میں جو فروغ ہوا ہے، اس میں کتنے ہی دوسرے اکابرین کی طرح گوپی چند نارنگ کا بڑا دخل رہا ہے۔ اردو کی محفلوں سے انھیں منہا کر دیا جائے تو محفل گویا چپ سادھ لے۔ ہم نے انھیں اپنی بات کہتے کہاں کہاں نہیں سنا۔ بڑے بڑے مجموعے دم سادھے انھیں سُنا کیے۔ اس میں کمال بات کہنے کے ڈھنگ کا نہیں، بات میں رچی علمیت کا تھا۔ جس موضوع پر بولے، اس میں معنی آفرینی اور لطف و اثر کا رس بھی گھولا۔ ایک بار اردو شاعری میں کربلا کے استعارے کی بات کر رہے تھے۔ اپنے عنوان کی ایسی منظرکشی کی کہ بعد میں ایک نوجوان نے مجھ سے کہا کہ نارنگ صاحب مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ اس پر میں نے کہا مسلمان ہونے کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ یہی بات میں نے نیویارک کی ایک ادبی شام میں بھی کہی جس کے خصوصی مہمان نارنگ صاحب کے علاوہ گلزار بھی تھے۔

سوچیے، یہ بات ہمیں کس نے سُجھائی، گوپی چند نارنگ نے۔ بڑا ظرف پایا ہے۔ اس میں کمال ان کی خطابت کا نہیں، علمیت کا ہے ماشاءاللہ۔

یہ چند اقتباسات پیش کرکے ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ نارنگ صاحب کی شخصیت، ان کی علمیت اور قابلیت کا ایک ایک پہلو ہمارے سامنے آ جائے کیونکہ طویل طویل مضامین ہر شخص پڑھ نہیں سکتا اس لیے مشاہیر کی مختصر اور جامع رائے پیش کرکے ہم نارنگ صاحب کی قابلیت اور علمیت سے خود بھی واقف ہونا چاہتے ہیں اور عام قاری کو بھی بتانا چاہتے ہیں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی عظیم ہستیاں دنیا میں بار بار

پیدا نہیں ہوتیں۔ ایسی ہستیاں ہمارے لیے، ہمارے وطن کے لیے فخر کی چیز ہیں۔
اگر ہم ان کی تقریروں تحریروں سے استفادہ حاصل نہ کر سکیں تو یہ ہماری بڑی کمی ہوگی۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا کے تمام معتبر ادیبوں نقادوں کی رائے پیش کر سکیں۔ ابھی سیکڑوں مشاہیر ایسے ہیں جن کے اقتباس لکھنا باقی ہے جسے ہم آئندہ پیش کر سکیں گے۔

○

# Biography

—Surinder Deol

> Citizens of Athens, aren't you ashamed to care so much about making all the money you can and advancing your reputation and prestige, while for truth and wisdom and the improvement of your souls you have no thought or care?
>
> Socrates

> I do not say with Socrates that the unexamined life is not worth living - that is unnecessarily harsh. However, when we guide our lives by our own pondered thoughts, it then is our life that we are living, not someone else's. In this sense, the unexamined life is not lived as fully.
>
> To live an examined life is to make a self-portrait.[1]
>
> Robert Nozick

Robert Nozick, a leading political philosopher of the twentieth century, is right in comparing an examined life to a self-portrait that we paint over an extended time, perhaps our entire life. In this sense, it is different from a photograph taken by a camera, which is a snapshot in a moment. Our self-portrait grows and evolves. It tells the story of how we

---

1. Robert Nozick, *The Examined Life: Philosophical Meditation* (New York: Simon & Schuster, 1989), 12-19.

lived our life-what we were most passionate about, what took our time and attention, what we valued most as we matured, and how we wrote our obituary in our mind as our life reached its end. An examined life can also be compared to living our lives consciously, always seeking some purpose or goal to live, showing full awareness of our thoughts and desires, and, more importantly, investing in our mental and intellectual growth. An examined life is not about achieving perfection in everything or being a perfectionist, though some people pursue that as a goal.

Professor Gopi Chand Narang has lived his life pursuing a passion. He has often said:

*ae dil tamaam naf'a hai saudaae i'shq mein*
*ik jaan ka ziyaan hai so aisa ziyaan nahien*

O, my heart, you have been losing your mind in *i'shq*.
There is no harm pursuing a passion all your life,
the only loss is the loss of a precious life, so it is no loss!

He calls it *safar-e i'shq* (the journey of love) for Urdu language and literature - achieving mastery in this language (which was not his mother tongue) that included its evolution as a language from its early roots, changes with time, the cultural context of its growth and development, its genres (poetry, prose, criticism) and sub-genres (ghazal, nazm, masnavi, novels, short stories, drama etc.). He made an early decision to not to be a poet, a short story writer, or a playwright, meaning not to be directly involved in the game but a kind of an outsider and a detached evaluator. This role was missing not only in Urdu but also in most other Indian languages. Look at his first book, *Karkhandari Dialect of Delhi Urdu;* or the second book, *Urdu Poetry and Indian*

*Mythology and Folk Tales*. The underlying theme of engagement in the Indian cultural matrix and Urdu's indigenous roots is underscored, and the path for the future explorative scholarly journey is clearly chartered. He is not a critic as critics conventionally are, but a cultural scholar, an open humanist thinker-critic, one of its kind which is difficult to describe, unless you read the whole range of subjects that he has covered. There are eye-opening characteristics about the Urdu's creative heritage that he has delineated. He is also an insightful theorist of both the eastern and western traditions of poetics and philosophy of literature, and a cultural historian that Urdu was thirsting for.

Although not very well understood, literary criticism has a long history going back to Aristotle. He wrote Poetics, a book about forms or a typology of works of art and literature. Even in the non-western languages like Sanskrit and Arabic, literary criticism was recognized as a distinct field of study many millennia ago. In the twentieth century, two schools of thought, namely, Russian Formalism in Russia and New Criticism in Britain and the US, gained widespread recognition. As we moved into the 1960s, structuralism, post-structuralism, and continental philosophy gained the upper hand. While the rest of the world was getting more advanced in literary theory and criticism, Urdu and other Indian languages were struggling to define even basic concepts like modernism. In Urdu, modernism was equated with the use of metaphors and similes or the use of free verse or blank verse in poetry or writing characterless stories. Professor Narang entered the field of cultural studies, literary criticism, and scholarship in the 1990s with his pathbreaking work *Structuralism, Post-Structuralism, and the Eastern*

*Poetics.*[1] The research for this monumental work was undertaken by him starting in the mid-1980. He was virtually entering an area of darkness where either people producing literature or evaluating it were not well informed of the latest developments in literary theory and criticism. Professor Narang's achievement was not limited to a good summing up of western concepts for the Indian reader. He also found traces of these ideas in the writings of Indian philosophers and Sanskrit scholars who had struggled with the same issues more than two thousand years ago. And interestingly, he discovered that Indian ideas had influenced some of the contemporary western scholars.

## Life and Times

We need to pause here and momentarily focus on professor Narang's personal history to gain a better understanding of the choices he made. Why did he decide to become a student of Urdu language at a time when in the post-partition era of fanatical madness Urdu was a much-maligned language? Why did he decide to be a literary theorist - a line of work that offered fewer avenues of professional recognition? These were tough decisions that he made. Presumably, his heart or intuition must have played a more significant role than analytical thinking.

Professor Narang was born on February 11, 1930, in a small town known as Dukki in Baluchistan, which is located on the border between Pakistan and Afghanistan. This place

---

1. Narang, Gopi Chand, *Saakhtiyaat, pas-Saakhtiyaat aur Mashriqi She'riyaat* (New Delhi: The National Council for the Promotion of Urdu Language, 2004 ed.). The original book was published in 1993, got the Sahitya Akademi main award in 1994, and so for has been translated in 13 Indian languages.

had no particular significance other than the fact that his father, a revenue officer in the provincial revenue service, was posted there at that time. The family moved a year later to Musa Khel where he received his early education. Talking about his childhood, professor Narang fondly remembers the intellectually nurturing influence of his father, Dharam Chand Narang, who was a scholar of Sanskrit and Persian. The language spoken at home was Saraiki, a beautiful mix of Indic and Western Punjabi, and it is a very soft language for one's ears. The elder Narang was passionate about literature, and he actively encouraged his children to be serious readers. As a result, the young Narang devoured writings by authors like Ratan Nath Sarshar, the poetry of Ghalib, Iqbal, and other great Urdu poets, in addition to serious works of theology, Bhakti, and Sufism by authors like Dr. Radhakrishanan and Dr. Syed Abid Husain at a very young age. Professor Narang was the second eldest child in the family among six brothers and four sisters. His mother, Tekan Bai, was a woman of extraordinary courage and social skills who was devoted to taking care of a large family without much additional help. At the same time, she was a person who always helped those who needed help. It was also remarkable that she single-handedly brought eight children safely to Delhi from Baluchistan during the madness of communal frenzy at the time of partition.

From his early years of schooling, professor Narang remembers Maulvi Abdul Aziz, who taught him the Urdu primer, and Saa'dat Mand, a teacher who oversaw physical training. Still, his real interest was in art and drawing, and as such, he encouraged his students to learn to draw. He also remembers with reverence the inspiring personality of

Maulavi Mureed Husain in his middle classes. Narang passed his matriculation examination from a high school in Leiah, Muzaffargarh securing the first position in 1946. There were major political events that were taking place far from the serene valleys and hills of Baluchistan that uprooted millions of lives because of the division of the country into India and Pakistan. When friends turned into enemies overnight, he was lucky that he was able to migrate to India in a Red Cross plane along with his elder brother during the Quetta holocaust of 1947. While a larger part of the family was still in Baluchistan, the young Narang learned to live independently in an unfamiliar city of Delhi and enrolled himself in Dilli College to continue his studies, which were disrupted by the tumult and disorder of partition. He received his BA degree in 1950 and Master's in Urdu four years later. His father did not join the rest of the family until he retired from the revenue service in 1956. The elder Narang was happy that his son had made great academic progress under very difficult circumstances. Still, he was not happy that he had chosen Urdu as the field of study instead of mathematics, physics or chemistry that could make him an engineer or a scientist. But for professor Narang, the pursuit of his heart's passion was more important than gaining a professional position in his life. That is why he has never regretted his decision to become a student and a champion of the Urdu language. It was clear to him that he wanted to follow his "bliss" which he had found in the Urdu language and, later in his life, in the broader field of linguistic and cultural studies.

The Urdu Department at the Delhi University had come into being at Prime Minister Jawaharlal Nehru's intervention.

Maulana Abul Kalam Azad, who was Minister of Education, had also played a role in this. As professor Narang pursued his doctoral degree, he was extremely fortunate to have had guidance and patronage of some of the brightest minds of that time, including Dr. Zakir Husain (who later became President of India), Dr. Tara Chand, Dr. Syed Abid Husain, Prof. Mohd. Mujeeb, Khwaja Ghulamus Syeddain, Dr. Khwaja Ahmad Faruqi, Sajjad Zaheer, Prof. Ale Ahmed Suroor, Prof. Syed Ehtisham Husain, Maulana Imtiaz Ali Arshi, Qazi Abdul Wudood, Malik Ram, Prof. Masood Hasan Rizvi Adeeb, Prof. Najeeb Ashraf Nadvi, and Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore. According to him, these people symbolized the values of India's composite heritage and were true role models of its highest ideals.

As the work relating to his doctoral degree was in its last stages, professor Narang was offered a temporary academic position at St. Stephens College in Delhi, which proved to be an excellent segue to a permanent place in the Urdu Department of Delhi University in 1959. This appointment was the start of a distinguished academic career that took him to different higher learning centers globally, including Wisconsin University at Madison, Minnesota University in Minneapolis, Oslo University in Norway. Also, he held higher-level academic position at Jamia Millia Islamia University. He is the author of seminal studies in Urdu, Hindi, and English, a Fellow of Sahitya Akademi, and D.Litt Hon. Causa by three Central Universities of North and South India. He holds Professor Emeritus position at Jamia Millia and Delhi University, two leading institutions of higher learning.

## An Inclusive Thinker

As someone who has devoted his entire life to the

development and promotion of the Urdu language, professor Narang takes a broad but detached centrist and an inclusive view while talking about the Urdu language status in pluralist India today. Any discussion about language, he feels, should reject fanaticism and extremism. Some people take an either-or position, meaning complete fulfillment of what they desire or nothing. These people are not in touch with reality. We cannot talk about Urdu without talking about Hindi at the same time because these two languages are related to each other as flesh and blood. Urdu owes much to Hindi and Sanskrit, including its core grammar and verbal and vocalic system. These are two independent languages but with deep links that should not be forgotten. Urdu is not Urdu without Hindi, and Hindi is not complete without Urdu.

Attaching a religious label on any language is a great fallacy, a dangerous misconception indeed. Language has a culture; it has no religion. Urdu is fortunate that it grew out of the culture that flourished over the centuries in the region between two great Indian rivers, Ganga and Jamuna, whose growth and development, both Hindus and Muslims participated in an equal measure. Urdu is the result of interactions between communities over hundreds of years. Besides Hindi, Urdu was also profusely nurtured in its growth by local and regional languages like Rajasthani, Awadhi, Braj Bhasha, etc. Therefore, the sweetness of Urdu draws its juices from multiple sources, and this should be recognized as we talk about the future of Urdu.

Professor Narang is a great defender of the Urdu language in Urdu script. He scientifically proves and underscores that the Urdu script is fully naturalized and transformed to cope with aspirated, retroflex, and nasalized

indigenous soil sounds. Even Urdu's narrow thinking protagonists do not know that these features are not shared with Arabic or Persian scripts as they don't have these sounds. Hindi and Urdu both come from the same base, is Khari Boli Hindustani. They share early history since Amir Khusrau's time, who called this hybrid speech Hindavi. Urdu in Urdu script is neither sematic like Arabic, nor Iranian like Persian. It is an Indo-Aryan language and occupies a unique place in the pluralistic lingual mosaic of India. He feels that the script of any language is its identity and beauty, and this originality and uniqueness should be maintained at all costs. This makes Urdu more inclusive and richer. He is mindful that the demand for Urdu books in Hindi's Devanagari script (literally meaning a script of the city of gods), especially in the field of verse, is gaining tremendous popularity. But Urdu remains Urdu in even in Devanagari script. Yet as a matter of public policy and going by the diversity and plurality of India, Urdu script should be defended, and the government should provide resources for the development of digital and other tools for Urdu script to keep pace with the changing times.

Professor Narang got interested in Mir Taqi Mir and Ghalib's poetical works at a very young age, and this left a permanent mark on his psyche. That is why he chose "cultural roots of Urdu poetry" as his doctoral dissertation subject. He later published an authoritative text on the "cultural context of Urdu ghazal" in Urdu, which has since been translated into English. In his words, "When we think of the Urdu ghazal, the following words come to mind: elegance, mindfulness, a surreptitious mystical feeling, density of thought, a solid system of denotations and connotations, passionate imagery, innate musicality, and rich

beautification of meaning. Each couplet has an imaginative story to tell, a compressed narrative of love, both existential and universal. The world of the ghazal is imaginative and metaphorical."[1] He thinks that Urdu ghazal is the most remarkable creation of the Indian mind that arose out of a particular cultural matrix that India offered. There is nothing like this in any other language of the world.

Although religion is not the creator of a language, it significantly influences its growth and development. But this influence is not one-directional. Extremist forms of religion exist only a few steps away from their syncretic forms. When language becomes literature, it performs a miraculous act of turning faith into something inclusive, pluralistic, and creative. Therefore, it is not a surprise that we find that most world scriptures are also works of great literature.

Language is a natural phenomenon; it is not a human artifact. People contribute to its development as participants; they are not mastering or controllers of any language's fate; neither any government agency could ever be. Language is in the domain of *loka*, that is, masses in a mysterious way. It is an autonomous self-regulating construct but not a construct at the will of any person or authority; it comes into being, develops, transforms, gives, and takes, and flowers in its independent way. No imposition works. Language arises from the gestures, figures, or sounds made in the caves, in the fields, in the theatres of war and peace. Mythology is, therefore, an excellent repository of language. If we are looking for fossils or archeology of any language, it will be

---

1. Gopi Chand Narang, trans. Surinder Deol, *The Urdu Ghazal: A Gift of India's Composite Culture*. (New Delhi: Oxford University Press, 2020) p. 3.

found in mythic sayings and stories. This constitutes the core of the language. When mythology is turned into a commodity by the politicians for their ideological purposes, any given language's story of origin can get mutilated. Mythology is the pristine glory of human imagination. It is not a record of real happenings. The language that describes events is akin to prose, which is precise and factual. The language used by mythology is poetic, and it was born when human imagination reached its pure and flawless expression.

Literature, art, and philosophy are all works of human creativity and imagination. These things have no boundaries. Although ideological movements like Socialism, Marxism, Fascism, and different shades of Nationalism and authoritarian regimes try to redefine language, literature and fine arts, these attempts do not last very long. When one movement dies or when one autocrat moves away from the scene, things get back to the normal course because human spirit that sustains art and literature can be suppressed for a short time, but it can't be destroyed for good.

Professor Narang believes that India as a country offered a great pluralist and peaceful environment where different cultures and languages flourished over long periods. Despite a torrent of foreign invasions, rise and fall of empires, different cultures grew where female beauty was appreciated and celebrated in incredible stone carvings. And where poets were uninhibited, where sex was not a taboo, where music and dance were part of the celebration of life, and where people lived in peace and harmony, though they worshipped different gods. Killing and rioting in the name of religion, ideology, or country started with incoming invaders and the

advent of British rule. This political order fanned the flames of religious divisions that eventually led to the partition of the country.

What is the proper place of literary scholarship and criticism? Its primary purpose, according to professor Narang, is to evaluate the quality and relevance of fiction and poetry produced at any time in an objective, detached manner without any given or imposed plan, be it religious or ideological. Although the literature is influenced by religion and ideology, it goes beyond both. It is the essence of humanity, the voice of brotherhood of man and love and freedom. Tools of scholarly criticism should be used both scientifically and imaginatively to find what is hidden within the author's words, its cultural context, and creativity's fingerprinting. Then the critic should muse about his subjective findings. That is why literary criticism goes beyond the limits of what is known as "stylistics", which is about things that exist at the surface. It is also different from philosophy because philosophy is about a given point of view. A literary scholar critic can go deeper into contextual analysis and use techniques like deconstruction. Still, in the end, literary criticism must shine a light on grey areas that were suppressed and what is unpolluted truth, without any fear and favor. An objective open analytical view is absolutely necessary. Prof. Narang in fact shuns labels. He maintains all labels are self-contradictory. Literature like reality is a flowing river, not static. It is dynamic. It transcends ideology. It must liberate. All given viewpoints are pollution. Creativity is freedom, freedom from dogma, from given, from imposed. Its role may be oppositional, but egalitarian.

## Eye of the Beholder

Professor Narang has received very warm and affectionate tributes from contemporaries, his critics, students, and readers. There is number of Urdu magazines that have published special issues to celebrate professor Narang's life and his contributions to literature. Many leading media organizations, such as Door Darshan and BBC, London, have produced rare recordings and documentaries on his work and services. There are dozens of books and dissertations that have been published offering critical appreciation and evaluation of his work. Distinguished novelist and short story writer Intizar Husain once stated, "When he comes to Pakistan, Professor Gopi Chand Narang represents India in one piece. I can't say this about anyone else. When he occupies the stage, we feel that India in its entirety is addressing us." Prominent Hindi writer, Kamleshwar, while talking about the critical literary contributions of Professor Narang to the Urdu language mentioned that every Indian language needs one Gopi Chand Narang.[1] The Jnanpeth Awardee great fiction writer, Qurratul Ain Hyder had described professor Narang as a "renaissance man" on one occasion. One of his class, the poet Gulzar has paid an exceptional tribute through the medium of his poetic pen. Here is the poem that he wrote to honor professor Narang.[2]

*do paaon se chalta dariya*
*ek paaon p thehri jhiil*

---

1. Sahitya Akademi, *Gopi Chand Narang - A Literary Odyssey* (Documentary).
2. Gulzar. 2019. *Gar Yaad Rahe* (Jhelum, Pakistan: Book Corner, 2019) 208.

*jhiil ki naabhi p rakhi hai*
*Urdu ki raushan qindiil*
*raushani jab bhanvraati hai to*
*jhiil bhanvar ban jaati hai!*

*bhanvar bhanvar mahvar mahvar*
*I'lm ka saaghar chhalak raha hai*
*tashna lab sab ok lagaaye dekh rahe hain*
*chhalke ga to nuur gire ga*
*nuur gire ga nuur piyein ge!*

A river moving
on two wheels.
A lake balanced
on one foot.
Settled
on the lake's navel
Urdu's bright
paper lantern.
When light is caught
in a vortex,
the lake turns
into a whirlpool.

Whirlpool, whirlpool,
axis, axis.
The goblet of knowledge
is overflowing.
People with parched lips
and folded palms
are watching.

When the goblet overflows,
magnificent light
will spread around.
Light will rain.
People will drink
particles of shiny light.

# Milestones : Safar-e I'shq Gopi Chand Narang

—Surinder Deol

1930

Born on February 11, 1930 in Dukki, Balochistan.
Date of birth as per official records--January 1, 1931.

1946

Passed Matriculation examination, securing the first position.

1947

Reached Delhi safely by a Red Cross plane at the peak of Quetta communal riots.

1948

Passed Intermediate examination from Dilli College, Delhi University.

1950

Passed BA examination from Dilli College, Delhi University.

1954

Passed MA examination in Urdu. First class first. Delhi University.

1955

Married Tara Narang.

1956

Father Dharam Chand Narang reached Delhi after his retirement from the provincial revenue service.

1957

Research Fellowship, Ministry of Education, Government of India.

Appointed as Lecturer in Urdu at St. Stephens College.

Birth of son, Arun Narang.

1958

Completed Doctoral degree from Delhi University with dissertation on: A Cultural Study of Urdu Poetry.

1959

Lecturer, Department of Urdu, Delhi University.

1960

Completed P.G. Diploma in Linguistics, Delhi University.

1961

Completed Hons. in Persian from the Punjab University.

Promoted as Reader, Department of Urdu, Delhi University.

1962

Ghalib Award, Government of Uttar Pradesh

1963

Visiting Professor Wisconsin University, Madison, USA (First time)

Commonwealth Fellowship for higher studies at the School of Oriental and African Studies, University of London.

1966

Attended a Summer School training course in linguistics at the Indiana University in USA under a grant from the Ford Foundation.

1968

Visiting Professor Wisconsin University, Madison, USA (Second time)

1969

Visiting Professor, Minnesota University, Minneapolis, USA.

1974

Married Manorma Narang.

Appointed Professor and Head, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia.

1976

Birth of son, Tarun Narang.

1977

1977

Iqbal Centenary Gold Medal Award by the President of Pakistan.

Mir Award, Mir National Akademi, Lucknow

1981

Appointed Dean, Faculty of Humanities and Languages, Jamia Millia Islamia.

Acting Vice Chancellor, Jamia Millia Islamia.

1982

Death of father, Dharam Chand Narang.

Aligarh Alumni Association Fellowship, Washington, D.C.

Canadian Urdu Writers  Society Award, Toronto.

1985

National Fellow, University Grants Commission.

Ghalib Award, Ghalib Institute, New Delhi.

1986

Appointed Professor, Department of Urdu, Delhi University.

1987

Death of mother, Tekan Bai.

1990

Honored by Padam Shri Award by the President of India.

Maulana Abul Kalam Azad Award, Uttar Pradesh Urdu Academy

1995

Honored by the Sahitya Akademi Award.

1997

Awarded Rockefeller Foundation Fellowship for Study at Bellajio Center in Italy.

Visiting Professor, Oslo University, Norway.

1998

Appointed Vice President, Sahitya Akademi (National Academy of Letters).

1999

Vice President, Urdu Academy, State of Delhi.

Hindi-Urdu Committee Award, Lucknow.

2002

Granted Indira Gandhi Memorial Fellowship.

Doha, Qatar, Furogh-e Urdu Adab Award.

2002-2004

Appointed Vice Chairman, National Council for the Promotion of Urdu Language.

2003

Elected President, Sahitya Akademi.

2004

Honored by Padam Bhushan Award by the President of India.

2005

Mazzini Gold Medal by Government of Italy.

European Urdu Writers Union Award, London.

2006

Professor Emeritus, Delhi University.

2007

D. Lit. Hon. Causa by Central University of Hyderabad, Hyderabad.

2009

Appointed Fellow, Sahitya Akademi.

D. Lit. Hon. Causa by Aligarh Muslim University, Aligarh.

2010

Bahadur Shah Zafar Award, Urdu Academy, State of Delhi.

2011

Bharati Bhasha Parishad Bengal Award, Kolkata.

2012

Honored by Sitara-e Imtiaz Award by the President of Pakistan.

Moorti Devi Award, Bharatiya Jnanpith.

Iqbal Samman, Government of Madhya Pradesh, Bhopal.

2013

Professor Emeritus, Jamia Millia Islamia.

2013

Kusumanjali Sahitya Samman, Kusumanjali Foundation, New Delhi.

2020

Dr. Raja Ram Mohan Roy National Award, Madhya Pradesh Government, Bhopal.

2021

Lifetime Achievement Award, Hindi-Urdu Sahitya Committee, Lucknow.

Note: Some other awards and recognitions conferred on Professor Gopi Chand Narang by the state, national, international literary and non-profit organizations have not been included in this list.

❍

# Bibliography
# Gopi Chand Narang

—Surinder Deol

## A. Books by Gopi Chand Narang[1]

Narang, Gopi Chand, ed. 1957. Bandah Navaaz Gesuudaraaz, 1321--1422. Mi'raajul'aashiqiin az Bandah Navaaz Gesuudaraaz. Delhi : Azad Kitab Ghar.

Narang, Gopi Chand.1961. Karkhandaari Dialect of Delhi Urdu. Delhi: Munshi Ram Manohar Lal.

Narang, Gopi Chand. 1962 Hindustaani qisson se maakhuuz Urdu masnaviyaan. New Delhi: Maktaba Jamia.

Narang, Gopi Chand. 1964. Urd? ki taa'liim ke lisaaniyaati pahlu. Delhi: Azad Kitab Ghar.

Narang, Gopi Chand. 1967. Readings in Literary Urdu Prose. Madison, Wisconsin: Dept. of Indian Studies, University of Wisconsin.

Narang, Gopi Chand, ed. 1968. Kaifi, Brij Mohan Dattaatriyah, Manshuuraati. Delhi: Anjuman Taraqqi-e Urdu, Hind.

---

1. This is a partial list. It does not include textbooks for school education and books translated into other Indian languages.

Narang Gopi Chand, ed. 1969. Mahruum: Pagdandi Amritsar ka Mahruum Number. New Delhi: Maktaba Jamia. [About Talok Chand Mahruum, Urdu poet.]

Narang, Gopi Chand and Khaliiq Anjum. 1970. Karbal katha ka lisaani mutaale'a. Delhi: Maktaba Shahrah Urdu.

Narang Gopi Chand, ed. 1971. Armughaan-e Maalik. Delhi: Jamal Press.

Narang, Gopi Chand. 1974. Imlaa Naamah. New Delhi.

Narang, Gopi Chand, ed. 1974. Indian Poetry Today. New Delhi: Indian Council for Cultural Relations, 1974--1981.

Narang, Gopi Chand. 1976. Puraanon ki kahaaniyaan. New Delhi : National Book Trust, India.

Narang, Gopi Chand, ed. 1979. Iqbal: Jaamia ke musannifiin ki nazar mein. New Delhi: Maktaba Jamia.

Narang, Gopi Chand. 1980. Urdu Foreword in Becker, Donald A. A Reverse Dictionary of Urdu New Delhi: Manohar.

Narang, Gopi Chand, ed. 1981. Anis Shanaasi. Delhi: Educational Publishing House.

Narang, Gopi Chand, ed. 1981. Urdu afsaanah: rivaayat aur masaail. Delhi: Educational Publishing House. [Papers presented at Indo-Pak Urdu Short Story Seminar, organized at Jamia Millia Islamia in 1980.]

Narang, Gopi Chand. 1982. Safar aashna. Delhi : Educational Publishing House.

Narang, Gopi Chand, ed. 1983. Iqbal ka fann. Delhi: Educational Publishing House.

Narang, Gopi Chand. 1983. Vazaahati kitaabiyaat. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language.

[Annual bibliography of Urdu books.]

Narang, Gopi Chand, ed. 1985. Contribution of Writers to Indian Freedom Movement. Palai (Kerala), Indian Writers Union.

Narang, Gopi Chand, ed. 1985. Lughat naviisi ke masaa'il. New Delhi: Mahnaama Kitab Numa. [On the problems of Urdu lexicography; contributed articles.]

Narang, Gopi Chand. 1985. Usluubiyaat-e Miir. Delhi: Educational Publishing House. [On the poetical style of Mir Taqi Mir, Urdu poet. Also Usluubiyaat-e Miir. 1985. Karachi: Anjuman Tarraqi-e Urdu Pakistan.]

Narang, Gopi Chand, ed. 1986. Intizar Husain aur un ke afsaane. Aligarh: Educational Book House. [Articles on the art of short story writing by Intizar Husain.]

Narang, Gopi Chand. 1986. Saaniha-e Karbala bataur she'ri isti'yaara: Urdu shaa'yiri ka ek takhliiqi rujhaan. Delhi: Educational Publishing House. [A study of the Karbala tragedy as a metaphor in Urdu poetry.]

Narang, Gopi Chand. 1987. Amir Khusrau ka Hindavi kalaam: ma'e nuskha-e Barlin, Zakhiira-e shpringer. Delhi: Educational Publishing House. [On the Hindustani poetry of Amir Khusrau Dehlavi, ca. 1253-1325; includes the text, with extensive editorial introduction of his poetic riddles in an 18th century manuscript preserved in Aloys Sprenger Collection in Berlin.]

Narang, Gopi Chand, ed. Urdu Section. 1987-1994. Encyclopaedia of Indian literature. New Delhi: Sahitya Akademi.

Narang, Gopi Chand, ed. 1988. Naya Urdu afsaana: intikhaab, tajziye, aur mubaahis, New Delhi : Urdu Akademi,

Delhi. [Proceedings of a seminar-cum workshop organized by the Urdu Akademi, Delhi on March 17-21, 1985 on modern Urdu short fiction.]

Narang, Gopi Chand, ed. trans. by Jai Ratan. 1989. Selected short stories: Rajinder Singh Bedi. New Delhi: Sahitya Akademi.

Narang, Gopi Chand, Adabi tanqiid aur usluubiyaat (Delhi: Educational Publishing House, 1989.) [Literary criticism and stylistics, with reference to Urdu literature.]

Narang, Gopi Chand, ed. trans. by Jai Ratan. 1990. Krishan Chander: selected short stories. New Delhi: Sahitya Akademi.

Narang, Gopi Chand, ed. 1990. Imla Nama, 2nd rev. enlarged ed. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language.

Narang, Gopi Chand. 1991. Urdu Language and Literature: Critical Perspectives. New Delhi: Sterling Publishers. [Critical essays on Urdu language, literature and philology.]

Narang, Gopi Chand. 1992. Qaari asaas tanqiid: mazhariyat aur qaari ki vaapsi. Aligarh: Educational Book House. [On reader response criticism with reference to Urdu literature.]

Narang, Gopi Chand. 1993. Saakhtiyaat pas- saakhtiyaat, aur mashriqi she'riyaat. Delhi: Educational Publishing House. [On structuralism (literary theory and poetics) with special reference to Sanskrit, Arabic, Persian and Urdu poetics. Includes quotes in English. This book has been widely translated into Indian languages such as Hindi, Bengali, Tamil, etc. Thirteen books have been published and the fourteenth is in process.]

Narang, Gopi Chand, ed. 1995. Balwant Singh ke behtariin afsaane (New Delhi : Sahitya Akademi. [Short stories and editorial introduction.]

Narang, Gopi Chand, ed. trans. by Jai Ratan. 1996. Selected short stories: Balwant Singh. New Delhi: Sahitya Akademi. [Anthology, translated from Urdu with an introduction: The art of Balwant Singh.]

Narang, Gopi Chand. 1996. Hindustaan ke Urdu musannifiin aur shu'ara. New Delhi: Urdu Academy, Delhi. [Who's who of Indian Urdu writers.]

Narang, Gopi Chand. 1996. Vazaahati kitaabiyaat. New Delhi : National Council for Promotion of Urdu Language [Annual bibliography of Urdu books.]

Narang, Gopi Chand, ed. Urdu Section. 1997. Masterpieces of Indian Literature, director and chief editor K. M. George. New Delhi: National Book Trust.

Narang, Gopi Chand, ed. 1998. Adab ka badalta manzarnaamah. New Delhi: Urdu Academy, Delhi. [On modern trends of literary criticism with reference to Urdu; seminar papers.]

Narang, Gopi Chand, ed. 1998. Dr. Zaakir Husain, shakhsiyat aur kaarnaame. New Delhi: Urdu Academy. [Life and work of Zakir Husain, 1897-1969, former president of India. The book contains contributed articles.]

Narang, Gopi Chand, contributor. 1999. Schmidt, Ruth Laila. Urdu, an Essential Grammar. London: Routledge.

Narang, Gopi Chand. 2000. Let's Learn Urdu: Beginner's Manual for Urdu Script. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language. [In English and Urdu.]

Narang, Gopi Chand. 2000. Workbook : Let's Learn Urdu: Beginner's manual for Urdu script. New Delhi : National Council for Promotion of Urdu Language.

Narang, Gopi Chand. 2001. Hindustaani qisson se maakhuuz Urdu masnaviyaan. 2nd rev and enlarged edition. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language. [On Urdu narrative poems based on Indian folk tales.]

Narang, Gopi Chand. 2001. Urd? kaise likhen: Urdu sikhaane ki bunyaadi kitab. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language.

Narang, Gopi Chand, ed. 2002. Biiswiin sadi mein Urdu adab. New Delhi: Sahitya Akademi. [On 20th century Urdu literature; contributed articles.]

Narang, Gopi Chand. 2002. Urdu ghazal aur Hindustani Zehn o tahziib. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language. [On Urdu ghazal and Indian mind and culture; a critical study.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2003. Azaadi ke baa'd Urdu afsaana. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language. [Selection of short stories written after 1947 in India.]

Narang, Gopi Chand. 2003. Hindustaan ki tahriike aazadi aur Urdu shaa'yiri. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language. [On Urdu poetry and its contribution to Indian freedom movement.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2003. Itlaaqi tanqiid: na'e tanaazur. New Delhi : Sahitya Akademi. [On applied criticism with reference to Urdu in new perspectives; papers presented at a seminar organized by the Sahitya Akademi, New Delhi.]

Narang, Gopi Chand. 2004 Saakhtiyaat, pas-saakhtiyaat, aur mashriqi sheri'yaat. rev. and enl. ed. New Delhi : National Council for Promotion of Urdu Language. [On structuralism (literary theory and poetics) with special reference to Sanskrit, Arabic, Persian and Urdu poetry. Includes quotes in English.]

Narang, Gopi Chand. Taraqqi pasandi, jadiidiyat, maaba'd-e jadiidiyat, (Mumbai: Aidshot Publications, 2004.) [Selected essays on 20th century Urdu literature.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2005. Aniis aur Dabiir: do sau saala seminar. New Delhi : Sahitya Akademi. [On the life and works of Mir Babbar Ali Anis, 1802-1879 and Mirza Salamat Ali Dabir, 1803-1875, Urdu poets; papers presented at bi-centenary seminar organized by the Sahitya Akademi, New Delhi in 2005.]

Narang, Gopi Chand. 2005. Jadidiyat ke baa'd. Delhi: Educational Publishing House. [On Urdu literature produced after modernism.]

Narang, Gopi Chand. 2005. Urdu par khulta dariicha. New Delhi: Vani Prakashan. [Urdu poetry and literature. In Hindi.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2005. Vali Dakni: tasavuff, insaaniyat aur mohabbat ka shaa'yir. Delhi: Sahitya Akademi. [On the life and work of Wali, 17-18th century Urdu poet; contributed articles presented at a seminar.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2006. Urd? ki nayii bastiyaan. New Delhi: Sahitya Akademi. [Contributed articles on the 20th century Urdu literature in foreign countries; papers presented at the seminar. Includes passages in English.]

Narang, Gopi Chand. 2006. Urdu zabaan aur lisaaniyaat.

Rampur: Rampur Raza Library. [On Urdu language history, linguistics and rhetoric. Includes articles in English.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2007. Sajjad Zahiir: adabi khidmaat aur taraqqi pasand tahriik. New Delhi: Sahitya Akademi. [On the life and work of Sajjad Zahir, Urdu author; papers presented at a seminar organized by the Sahitya Akademi.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2008. Firaaq Gorakhpuri: shaa'yir, naqqaad, daanishvar. New Delhi: Sahitya Akademi. [On the works of Firaq Gorakhpuri, 1896-1982, Urdu poet; contributed articles presented at a seminar organized by the Sahitya Akademi.]

Narang, Gopi Chand. 2009. Fiction she'riyaat: tashkiil o tanqiid. Delhi: Educational Publishing House. [A study on the works of selected 20th century Urdu fiction writers. Includes one article in English.]

Narang, Gopi Chand, ed. 2010. Khwaja Ahmad Faaruqi ke khutuut Gopi Chand Narang ke naam. Patna: Khuda Bakhsh Oriental Public Library. [Personal letters of an Urdu scholar to his disciple.]

Narang, Gopi Chand. 2011. Kaaghaz-e aatish zada: Pichhle pachaas barson ke tanqiidi va tahqiiqi mazamiin jo kisi majmu'e mein shaamil nahien. Delhi : Educational Publishing House.

Narang, Gopi Chand. 2012. Tapish namah-e tamanna. Delhi: Educational Publishing House.

Narang, Gopi Chand. 2013. Ghaalib: maa'ni aafriini, jadalyaati vaza' shuunita aur she'riyaat. New Delhi: Sahitya Akademi. [A study of Mirza Asadullah Khan Ghalib, 1797-1869, Urdu and Persian poet.]

Narang, Gopi Chand, trans. Surinder Deol. 2017. Ghalib: Innovative Meaning and the Ingenious Mind. New Delhi: Oxford University Press.

Narang, Gopi Chand, trans. Surinder Deol. 2019. Faiz Ahmed Faiz: Thought Structure, Evolutionary Love and Aesthetic Sensibility. New Delhi: Sahitya Akademi. [Sahitya Akademi Samvatsar Lecture: Thirty Three delivered by Professor Gopi Chand Narang during Akademi's Festival of Letters in 2019.]

Narang, Gopi Chand, contributor. Surinder Deol. 2017. SAHIR: A Literary Portrait. New Delhi: Oxford University Press. [Foreword by Gopi Chand Narang.]

Narang, Gopi Chand, trans. Surinder Deol. 2020. The Urdu Ghazal: A Gift of India's Composite Culture. New Delhi: Oxford University Press. [About the origin and evolution of the Urdu ghazal over the past 300 years and the cultural influences that shaped it.]

Narang, Gopi Chand, trans. by Surinder Deol. Forthcoming. The Hidden Garden: Mir Taqi Mir.

Narang, Gopi Chand, contributor. Surinder Deol. Forthcoming. Faiz: From Passionate Love to a Cosmic Vision. [Foreword by Gopi Chand Narang.]

Narang, Gopi Chand. 2017. Kulliyaat-e Hindavi Amir Khusrau: Ma'e Tashriih o Tajziya Nuskha-e Berlin. New Delhi: Sahitya Akademi.

Narang, Gopi Chand, ed. 2017. Mashaher Ke Khutoot Gopi Chand Narang Ke Naam. Vol I and Vol II. 2019. Vol III and IV. 2020. Delhi: ArshiyaPublications.

Narang, Gopi Chand, trans. in Hindi Nusrat Zaheer. 2020. Ghalib: Arthvatta, Rachnatamakta evam Shunyata. New Delhi: Sahitya Akademi.

Narang, Gopi Chand, trans. in English Surinder Deol. 2021. The Hidden Garden: Mir Taqi Mir. New Delhi: Penguin Random House.

Narang, Gopi Chand, selected and translated Surinder Deol. 2021. Twilight Colours: Selected Writings of Prof. Gopi Chand Narang (Narang Reader). New Delhi: Sahitya Akademi.

Narang, Gopi Chand, trans. in Hindi Mohd. Musa Raza. 2021. Amir Khusro Hindavi Lok Kavya Sankalan. New Delhi: Vani Prakashan.

Narang, Gopi Chand, trans. in Telugu Abdul Waheed. 2021. Sanrachnavad, Uttar Sanrachnavad evam Prachya Kavya Shastra. Bangalore: Sahitya Akademi.

Narang, Gopi Chand, trans. in Hindi Mohammad Ayyub Khab. 2021. Hindustan ka Swatantrata Sangram aur Urdu Shairi. New Delhi: Vani Prakashan.

Narang, Gopi Chand and Surinder Deol, Edt. Modern Indian Classics : Rajinder SIngh Bedi : Selected short stories. New Delhi: Penguin and Random House. Forthcoming

## B. Books About Professor Gopi Chand Narang[1]

Hamid Ali Khan. Gopi Chand Narang: Hayaat o Khidmaat. 1995. Delhi: Educational Publishing House.

---

1. This list does not include M. Phil. and doctoral level dissertations written by students at India's leading universities about the life and literary contributions of Professor Narang.

Shahryar, Abul Kalaam Qasmi, eds. 1995. Gopi Chand Narang: shakhsiyat aur adabi khidmaat. New Delhi: Mahnama Kitab Numa.

Harganvi, Manaazir Ashiq. Gopi Chand Narang aur adabi nazariya saazi. 1995. New Delhi: Adab Publications.

Haq, Abdul, ed. 1996. Armughaan-e Narang. New Delhi: Modern Publishing House. [Selected papers in honor of Prof. Gopi Chand Narang on the eve of his superannuation from the University of Delhi.]

Anjum, Shahzad, ed. 2003. Diidavar Naqqaad Gopi Chand Narang, edited by Shahzåd Anjum. Delhi: Education Publishing House.

Tarzi, Abdul Mannaan. 2003. Narang Zaar: Professor Narang ki hayaat aur adabi khidmaat ka majmuu'yi tanqiidi jaiza. New Delhi: Maktaba Iste'aara.

Ejaz, Fe. Seen., ed. 2004. Insha's Gopi Chand Narang (Regular Book Edition). Kolkatta: Insha Publications.

Sironji, Saifi. 2006. Gopi Chand Narang aur Urdu tanqiid. Sironj: Intisaab Publications.

Vikram, Nank Kishore. 2008. Bain ul-Aqwaami Urdu Shakhsiiyat: Gopi Chand Narang. Delhi: Publishers & Advertisers.

Bakhsh, Maula. 2009. Jadiid adabi theory aur Gopi Chand Narang. Delhi: Educational Pub. House.

Sadaf, Mushtaq. 2010. Dekhna taqriir ki lazzat: Gopi Chand Narang ke adabi mukaalmaat. Bangalore: Karnatak Urdu Akademi.

Sironji, Saifi. 2012. Maaba'ad-e Jadiidiyat aur Gopi Chand Narang. Sironj: Intisaab Publications.

Hargaanvi, Manaazir Ashiq. 2013. Tanqiid ka naya manzar naamah aur Gopi Chand Narang. Delhi: Arshiya Publications.

Mahbuub, Rahi. 2013. Gopi Chand Narang, ek hama jihat shakhsiyat. New Delhi: M. R. Publications.

Sadaf, Mushtaq, ed. 2014. Adabi theory, sheiri'yaat aur Gopi Chand Narang. Delhi: Educational Publishing House.

Allahabadi, Danish, ed. 2014. Gopi Chand Narang aur Ghalib shanaasi. Delhi: Educational Publishing House.

Akhtar, Jameel. 2015. Zindagi Nama: Gopi Chand Narang. Delhi: Educational Publishing House.

Nabi, Athar, ed. 2016. Hasht pahlu naqqaad Gopi Chand Narang. Delhi: Arshiya Publications.

Shahnaaz Qaadiri. 2019. Prof. Gopi Chand Narang ki Tanqiid Nigaari. Delhi: M.R. Publications.

## C. Special Gopi Chand Narang Issues of Literary Magazines

Alfaaz, Aligarh. 1987. Nurul Hasan Naqvi, ed.

Insha, Kolkata. 2004. F. S. Ejaz, ed.

Chaharsuu, Rawalpindi. 2004. Gulzar Javed, ed.

She'ro Hikmat, Hyderabad. 2005. Shaharyar, Mughanni Tabassum, eds.

Tarviij, Cuttack. 2007. Khavar Naqib, ed.

Aa'lmi Urdu Adab, Delhi. 2008. Nand Kishore Vikram, ed.

Rang, Dhanbad. 2010. Shan Bharti, Mushtaq Sadaf, eds.

Intisaab, Saronji. 2011. Saifi Saronji, ed.

Karvaan-e Adab, Bhopal. 2012. Javed Yazdani, Kausar Yazdani, eds.

Isnaaf-e Adab, Muzaffarpur. 2014. Hasan Raza, ed.

Sabaqe Urdu, Bidhohi. 2014, Danish Allahabadi, ed.

Tahriir-e Nau, Bombay 2015. Zahir Ansari, ed.

Aalami Zabaan, Sironj, Oct. 2020. Aafaaq Saifi, ed.

## D. Documentaries and Presentations Available on YouTube

Gopi Chand Narang, Jashn-e Jamaluddin Mushaira, Dubai, 1989.

Gopi Chand Narasng, Jashn-e Sipas, 1996.

Gopi Chand Narang at Mahfil-e Mushaira, Muscat, 2006.

Gopi Chand Narang Documentary by Maulana Azad Urdu University, Hyderabad, Parts I, II & III. 2008.

A speech by Gopi Chand Narang at the 16th Annual Nirankari Sant Samagam held in Delhi, 2008.

Gopi Chand Narang in Muscat Mushaira, 2009.

Gopi Chand Narang - Writers Forum, Toronto. An evening with Wali Alam Shaheen. Chief Guest: Gopi Chand Narang, 2010.

Gopi Chand Narang-A Literary Odyssey, 2012.

Gopi Chand Narang in conversation. BBC, London (an audio recording), 2012.

Gopi Chand Narang Ke Saath Urdu Adabi Nashist by Ahmed Mubarak, 2012.

"Why Ghalib Speaks To Me." A talk by Gopi Chand Narang, 2013

Gopi Chand Narang on the book launch of The Treasure by Surinder Deol, 2014.

Gopi Chand Narang on Urdu Poetry and Karbala Episode, 2014.

Gopi Chand Narang, Urdu Mushaira, Muscat, 2014.

Gopi Chand Narang Interview at Rekhta Studio, Parts I & II, 2015.

Legends of Urdu: Gopi Chand Narang, a film by Suresh Kohli, 2015.

Gopi Chand Narang in conversation with Prof. Shafey Kidwai, Jashn-e Rekhta, 2015.

Gopi Chand Narang Speech at Khirman Book Launch, 2015.

Gopi Chand Narang in Literary Forum on "Hali Fahmi: Mukhtalif Jehat" at Sahitya Akademi, 2016.

Tera Bayaan Ghalib by Salim Arif. Book release by Gulzar and Gopi Chand Narang, Jashn-e Rekhta 2016.

Mirza Ghalib: The Poet of Love and Coexistence. Panel discussion at Jashn-e Rekhta, 2016.

Indian Mythology in Urdu Poetry, Jashne Rekhta, 4th Edition, 2017.

Gopi Chand Narang on Amir Khusrau, Jashne Rekhta, 2014.

Ghalib: Innovative Meanings and the Ingenious Mind by Gopi Chand Narang: Book Launch, 2017.

Faiz Ke Teen Ishq, 5th Jashne Rekhta, 2018

2019 Samvatsar Lecture by Gopi Chand Narang, Sahitya Akademi, January 30, 2019.

Tuk Meer Ko Suno: Different Aspects of Meer's Poetry, 6th Jashn-e Rekhta, 2019.

Gopi Chand Narang. Life Story-an exclusive recording for the archives of Luttfullah Khan, 2019.

Gopi Chand Narang Se Ek Mulaqat, Parts I & II (A Doordarshan Presentation by Maharaj Shah), 2019.

Gopi Chand Narang speaking on Majrooh Sultanpuri Sadi Seminar, November 2019.

Divan-e Ghalib aur Abdul Rehman Bijnori: Gopi Chand Narang ki ek tehreer, an audio recording by Iqtebaas, 2019.

Oxford & Rekhta, Lauch of The Urdu Ghazal : A Gift of Composite Indian Culture, 15 February 2020.

Ghalib to Sahir : Gopi Chand Narang on World Poetry Day, Part one and two, 21 March 2020.

Vertex Events, Pushkin Agha: Urdu ka Safar, 17 April 2020

Jashn-e Urdu Dubai, Ambariin Hasiib Ambar, 15 August 2020.

Gopi Chand Narang on Firaq Gorakhpuri, Hindi Urdu Sahitya Award Committee, 22 November 2020.

Karachi Art Council: Inaugural Session, 3 December 2020.

The Urdu Ghazal : Prof. Gopi Chand Narang & Gulzar, Rekhta & Oxford, 2 December 2020.

Note: Dates mentioned relate to when a video was uploaded to YouTube. They may not necessarily be the exact dates when the event took place.

میر تقی میر نے جو ''عیبِ طول کلام مت کیجو'' کہا، اسے شاہدہ اُسید رضوی نے ''کم لکھنے'' کی ہدایت سمجھ کر خود کو لکھنے لکھانے سے بہت قریب کبھی نہیں رکھا، جبکہ دوسری طرف، وہ ادب سے خود کو کسی طور دور کبھی نہیں کر سکیں۔ قلم کاری کم کی مگر پڑھنے اور مطالعہ کا شوق زندہ رکھا۔ جس لڑکی نے روزنامہ 'سیاست' حیدر آباد دکن کے شیشہ و تیشہ کالم سے 1955 میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے آغاز کیا اور پھر 1961 میں 'پاگل' کے عنوان سے رسالہ 'شعور' کے لیے اپنا پہلا افسانہ بھی لکھا، اسی لڑکی نے جب اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھا تو قلم کے سفر کو کسی کسی طور پر جاری رکھا۔ اپنے ذوق کے مطابق، پاکستان کے بڑے روزنامے Dawn E-Paper کے اردو سیکشن کے لیے مستقل بلاگ بھی لکھے اور گاہے گاہے لندن میں منعقد ہونے والی اردو محفلوں کی رپورٹ روزنامہ 'جنگ' کے لیے لکھتی رہیں۔ ایک طویل عرصے سے مغربی دنیا میں رہنے کے باوجود شاہدہ اُسید کی تالیف 'باتیں ہماری یاد رہیں' اس بات کا ثبوت ہے کہ شاہدہ کو اردو ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔

(سید ثروت فہمی)

**Baaten Hamari Yaad Rahen**
by Shahida Osaid Rizvi

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com

ISBN 93-90682-45-2
9 789390 682454

+91 9971-77-5969
www.arshiapublications.com
arshiapublicationspvt@gmail.com

A for Arshia Publications